# جہاں گردی

عامر بن علی

# جہاں گردی

عامر بن علی

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0331-4489310
E-mail: nastalique786@gmail.com

# انتساب

## پاکستان کی مٹی

کے نام!

بارش کے بعد جس میں سے ایسی سوندھی خوشبو اٹھتی ہے
جس کی پوری دنیا میں کوئی مثال نہیں

# ترتیب

# سرِ آغاز

کتاب کا تعارف اور دیباچہ لکھنا مجھے اکثر تکلف محسوس ہوتا ہے۔ دوستوں کی اس بابت رائے مگر میرے خیالات سے متصادم ہے۔ بہی خواہوں کا اصرار ہے کہ ابتدائیے میں یہ بیان ضروری ہے کہ جہاں گردی کیوں اور کیسے لکھی گئی؟ سوال جائز اور اہم ہے۔ لہٰذا راقم طرازی پر آمادہ ہوا ہوں۔ چونکہ یہ استفسار میں نے خود سے بھی کئی بار کیا تھا کہ آخر اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ بالفاظ دیگر، اس کے بغیر بھی تو اچھا بھلا سنسار چل ہی رہا ہے۔ پھر یہ تحریر کیا معنی رکھتی ہے؟

''جہاں گردی'' تحریر کرنے کا میرے ذہن میں بنیادی مقصد اور محرک تو یہ خیال تھا کہ جن ملکوں میں برس ہا برس قیام پذیر رہا۔ اس سیاحی کے دوران بہت سی باتیں ان معاشروں کے بارے میں سیکھنے کا موقع ملا۔ اگر کوئی ہم وطن پاکستانی ان علاقوں میں جانا چاہے تو میرے مشاہدات و تجربات کے بیان سے امکانی طور پر اس سیاح کے لیے کچھ نہ کچھ سہولت پیدا ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کسی مسافر کے لیے یہ کتاب کسی راحت اور آسانی کا باعث بن جائے۔ اگر دور دراز کے ان ممالک میں سفر کی غرض سے جانے کا ارادہ نہیں بھی ہے تب بھی کسی غیر ملکی سرزمین کو اپنے ہم وطن کی آنکھ سے دیکھنا اور اس کے تجربات و مشاہدات کی روداد سننا میرے نزدیک لطف پیدا کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کئی اور انداز سے کسی کا بھلا ہو سکتا ہے۔ اپنی قوم کے کسی فرد کے قلم سے اپنی قومی زبان میں تحریر کردہ اقوام عالم کے بارے میں بے لاگ تبصرے، تجزیے پڑھنا یقیناً گوگل سرچ انجن پر دی گئی معلومات سے مختلف نوع کا تجربہ ہے۔

جہاں گردی میں شامل اکثر تحاریر روزنامہ جنگ اور روزنامہ خبریں میں کالموں کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ تحریریں ہمارے ادبی پرچے ماہنامہ ارژنگ لاہور میں بھی

چھپ چکی ہیں۔ اسی سبب سے ہوسکتا ہے کہ اس سفرنامے میں آپ کو کسی ناول کی کہانی جیسا بہاؤ نظر نہ آئے۔ بلکہ شاعری پڑھنے جیسا تاثر قائم ہو جائے۔ بہت سارا مواد خصوصی طور پر اسی کتاب کے لیے ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔ خاص بات اس روداد سفر کی یہ ہے کہ بیرونی دنیا کے متعلق جن دو خطوط پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے وہ جاپان اور لاطینی امریکہ ہیں۔ راقم نے جاپان میں ایک عشرے سے زیادہ عرصہ قیام کیا ہے اور لاطینی امریکہ میں بھی کئی برس گزارے ہیں۔ ان دونوں خطوں کی زبان یعنی جاپانی اور ہسپانوی پر مجھے دسترس حاصل ہے۔ اس لیے خاکسار کے تجزیوں، تبصروں اور مشاہدات میں آپ کو جو گہرائی ملے گی اس بیان کی نظیر اردو ادب میں اس موضوع پر کم کم ہی ملے گی۔ اس بابت میری ہفت زبانی نے بہت مدد کی ہے۔

اس خیال سے بھی بہت سی باتیں تحریر کی ہیں کہ اگر بیرونی دنیا میں کوئی اچھا کام ہو رہا ہے تو وہ اچھی چیز ہمارے ہاں بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی منظر دیکھ کر دل و دماغ پر اچھا تاثر آیا تو اس اُمید پر بیان کر ڈالا کہ ہو سکتا ہے قارئین بھی اسے پڑھ کر لطف اندوز ہو جائیں۔ مگر لطف پیدا کرنے کے لیے فرضی قصے، کہانیوں اور خودنمائی سے احتراز کیا گیا ہے۔ اگرچہ جدید ادباء کے نزدیک سفرنامہ فکشن ہے مگر پھر بھی میں خود پر جھوٹے بہتان لگانے کے حق میں نہیں ہوں۔ بات سادہ سی ہے کہ جس تحریر کو میں اپنے گھر لے کر جانا پسند نہیں کرتا اور میرے اہل خانہ جسے نہ پڑھ سکیں ایسا مواد میں شائع کروانے کے حق میں نہیں ہوں۔ یہ سفرنامہ صرف بالغوں کے لیے نہیں ہے بلکہ گھر کے ہر فرد کے لیے ہے۔ چلتی ہوئی ٹرین میں بیٹھ کر کسی گاؤں کا نظارہ کرنا ایک بات ہے اور اس گاؤں میں زندگی کا ایک حصہ گزار کر دیکھنا بالکل مختلف تجربہ ہے۔ فضا سے شہر کا طائرانہ جائزہ لینے اور شہر کے لوگوں کے درمیان زیست کرنے میں جو فرق ہے وہی فرق آپ کو اس سفرنامے کا اس موضوع پر دیگر مصنفین کی تحریروں میں نظر آئے گا۔

عامر بن علی

**605-Samaria Mansion**
**Koenji-Minami 1-6-5**
**Suginami-Ku Tokyo Japan**
**Email: amirbinalis@hotmail.com**

**URL: www.amirbinali.com**

حصہ اول

# احوالِ جاپان

# چیری کے پھول

انقلاب اور رومان کے شاعر فیض احمد فیضؔ نے کسی کے بام پر آنے کو موسم بہار کی آمد کا اعلان قرار دیا ہے۔ جبکہ جاپان میں چیری بلاسم کے درخت پر پھولوں کا کھلنا موسم گل کی دلیل مانا جاتا ہے۔ سفید اور گلابی رنگ کا یہ ننھا سا پھول جو پاکیزگی اور طہارت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس ملک کا قومی پھول ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ چیری کے درخت سارا سال بے برگ ثمر، ٹنڈ منڈ کھڑے رہتے ہیں، بہار کے موسم میں چند دن کے لئے ان پر پھول کھلتے ہیں۔ ہر ضلع میں موسم کے اعتبار سے چیری کی شاخیں الگ الگ وقت پر پھول اٹھاتی ہیں۔ آج کل ان پھولوں کے جوبن کی رُت ہے۔ ان پھولوں کو دیکھنا ایک باقاعدہ تہوار ہے۔ شاخوں کے پھول اٹھانے کے ساتھ ہی ان کے دیدار کا تیوہار شروع ہوجاتا ہے، جسے مقامی زبان میں ''ہنامی'' کہتے ہیں۔ جس کا لفظی مطلب ''پھول تکنا'' ہے۔ اسے جاپانی سماج میں سب سے نمایاں تہوار کہا جائے تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ اگر چہ کیلنڈر میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

قارئین کے ذہن میں یہ بھی سوال ابھر سکتا ہے کہ بھلا جاپان کے قومی پھول، جسے مقامی زبان میں ''ساکورا'' کہتے ہیں، کا پاکستان کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے چیری کے پیڑ اور اس کے پھول کی ابتداء اسلام آباد سے کچھ ہی

دورکوہ ہمالیہ کے سلسلے سے منسوب کی جاتی ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ شجر ہندوستان کے علاوہ یورپ، سائبیریا، امریکہ،کینیڈا سمیت چین،کوریا اور جاپان تک پھیل گیا۔جاپانی اپنے فنِ باغبانی کے حوالے سے پورے عالم میں مشہور ہیں۔انہوں نے چیری کی ایسی اقسام ایجاد کرلیں جن میں پھل نہیں لگتا مگر پھول زیادہ آتے ہیں۔آج کل یہ نمائشی اقسام ہی زیادہ مقبول ہیں،جن پر فقط پھول اگتے ہیں اور برگ ثمر سے بے نیازی کے باوجود پھول اٹھانے پر چیری کا پیڑ جنت کا شجر محسوس ہوتا ہے۔

چیری کے پھول کو جاپان کی روح کہا جاتا ہے، یہ ان ثقافتی وسماجی علامات میں سے ایک ہے، جسے اس ملک کا چہرہ شمار کیا جاتا ہے،جیسے بلٹ ٹرین، سبز چائے، جدید الیکٹرونکس، ابلے ہوئے چاولوں پر کچی مچھلی کی تہہ، جسے ''سوشی'' کہا جاتا ہے، فیوجی کا پہاڑ،کورنش بجا لاتے ہوئے فرشی سلام،گھر کے داخلی دروازے پر جوتے اتارنے کی روایت وغیرہ۔چیری بلاسم کے درخت عموماً دریاؤں،ندی،نالوں کے اطراف اور پارکوں کے علاوہ بدھ مت اور شنٹو مذہب کی قدیم عبادت گاہوں سے ملحقہ باغات کا بھی ضروری حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ایک ایسی ہی عبادت گاہ کے باغ میں شام ڈھلے میں چیری کے پھول دیکھ رہا تھا تو ایک بدھ بھکشو سے ملاقات ہوگئی۔ویسے تو اس بھکشو کا میرے ساتھ گفتگو کرنے کا بنیادی مقصد اپنی انگریزی زبان کی پریکٹس کرنا محسوس ہورہا تھا،مگر میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے استفسار کیا کہ عبادت گاہ کے باہر جوتے اتارنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اہلِ جاپان گھر میں داخل ہونے سے پہلے جوتے کیوں اتارتے ہیں؟ تو جوان بدھ بھکشو کا جواب تھا کہ ایک پہلو تو صفائی کا ہے، آدمی سارا دن پتہ نہیں کہاں کہاں جوتے لے کر پھرتا ہے، ان کے ساتھ مختلف طرح کے مغلاظات اور جراثیم بھی لگ جاتے ہیں، پھر انہی جوتوں کے ساتھ گھر کے اندر گھومنا حفظانِ صحت کے اصولوں کے منافی بات ہے۔دوسری وجہ اس نے بڑی عجیب بتائی، جوتے گھر کے باہر اتارنے کا مقصد باہر کی سوچوں اور مسائل کو گھر سے باہر رکھنا ہوتا ہے۔یہ ایک علامتی بات ہے۔کہ اب میں ایک آشرم میں داخل

ہورہا ہوں۔جنوبی امریکہ کے ملک چلی کے دارلحکومت سنٹیا گو کے مندر کا پنڈت میرا دوست سندھی برہمن روی کیولانی ہے، اس بابت ہندو مذہبی نظریات کے پیش نظر اس کا کہنا ہے کہ گھر کے اندر چمڑے کا پھرنا منحوس ہوتا ہے۔وجہ اس کی یہ بتاتا ہے کہ کسی مردہ جانور کی جلد سے ہی عموماً جوتا تیار کیا جاتا ہے۔جوتے اتار کر گھروں اور معبدوں میں داخل ہونے کی قدیم روایت ایشیاء کے تمام مذاہب میں ملتی ہے مگر بدھ بھکشو کی پیش کردہ منطق بالکل مختلف ہے۔

چیری بلاسم کے گلابی اور سفید رنگ میں ملبوس پھولوں کو ان کی پاکیزگی کے سبب جاپان کی روح کہا جاتا ہے، مگر میرے خیال میں ان سے عقیدت کی وجہ شاید خوبصورتی سے زیادہ ان کی زندگی کا اختصار بھی ہے، جو کہ عموماً دو، چار دن ہی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب پھولوں پر جوبن آتا ہے تو لوگ چٹائیاں لیکر باغوں اور دریاؤں کے کنارے ان درختوں کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔کھانے، شراب اور موسیقی سے دل بہلاتے ہیں۔کہیں کسی فیکٹری کے اہلکار منڈلی جمائے بیٹھے ہیں تو کسی جگہ طالب علموں کی ٹولی گپ شپ لڑانے میں مشغول ہے۔کسی پھولوں سے لدے درخت کے نیچے محلے کے بوڑھے، بوڑھیاں محفل سجائے ہوئے ہیں تو کہیں کسی دفتر کا سٹاف جشن بہاراں منا رہا ہے۔چند دنوں کے لیے تو یہ پھول جہاں جہاں کھلتے ہیں، اس شہر میں زندگی کا نظام الاوقات ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں چیری بلاسم تلے بیٹھے ہنستے مسکراتے خوشگوار چہروں کو دیکھ کر بعض اوقات لگتا ہے کہ چند دن کے لیے ہی سہی، چیری کے پھول مزاج بھی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں نرگس کے ہزاروں سال تک جو بے نور رہنے کا تذکرہ کیا تھا، وہ سارا سال چیری کے درخت کی بے نوری پر صادق آتا ہے، البتہ دو، چار دن کے لیے ہی سہی، چیری بلاسم کے پیڑ کی شاخیں جب پھول اٹھاتی ہیں تو واقعی چمن میں دیدہ ور پیدا کر جاتی ہیں۔

# بدلتے ذوق وشوق

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ صرف افراد کے مزاج میں ہی تبدیلی نہیں آتی، اقوام کے رویے اور پسند، ناپسند بھی بدلتی رہتی ہے۔ اسی لیے تو ثقافت کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ زندہ قوموں کے طرز زندگی میں تغیر لازمی امر ہے۔ رہن سہن میں ارتقاء نا قابل مفر عمل ہے۔ جاپانی لوگوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ نئی چیز اپنانے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ روایت پسندی، سادگی اور جدت پرستی کا ایسا خوبصورت امتزاج میں نے تو اس جہان کے کسی اور خطے کے لوگوں میں نہیں پایا۔ جاپانی رسم الخط کا بڑا حصہ صدیوں پہلے چین سے درآمد کیا گیا اور اسے جوں کا توں اپنا لیا گیا۔ کھانے کے میز پر نظر ڈالیں تو بیرونی ممالک سے آنے والی کئی اشیائے خوردنی ایسی ہیں جو اب یہاں کے روایتی کھانوں کا حصہ بن چکی ہیں۔ غیر ملکی ریستورانوں کا میں نے قصداً ذکر نہیں کیا، ورنہ شاید ہی دنیا کا کوئی قابل ذکر ملک ایسا ہوگا جس کے روایتی کھانوں کا یہاں ریستوران موجود نہ ہو، اور مقامی باشندے اس پکوان کے گاہک نہ ہوں۔

کھانے پینے کے ذوق میں ارتقاء کی ایک تازہ مثال کافی کا بڑھتا ہوا استعمال

ہے۔صدیوں سے اس دیس میں سبز چائے اور بھنے چاول سے کشید کردہ چائے روایتی مشروب مانے جاتے ہیں۔چائے بنانے اور پیش کرنے کا فن یہاں کے لوگوں کو اتنا عزیز ہے کہ اس موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔باقاعدہ سکول کھلے ہوئے ہیں جو فقط چائے بنانے اور پیش کرنے کی تربیت دیتے ہیں، ایسے سکول خواتین میں خصوصاً بہت مقبول ہیں۔چائے پینے کی پر تکلف تقریبات منعقد کی جاتی ہیں، ہم مشرب لوگ بعض اوقات سینکڑوں کلومیٹر کا سفر طے کر کے صرف چائے کی پیالی پینے کے واسطے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ہلکی پھلکی گپ شپ کرتے ہیں۔گفتگو کا دائرہ عموماً ثقافتی و معاشرتی موضوعات ہوتے ہیں، ثقیل گفتگو سے پرہیز کیا جاتا ہے،اور بعض اوقات تو رسمی تعارف ہی ہو پاتا ہے تو یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے، اس موضوع پر الگ سے کبھی مضمون لکھوں گا مگر آج کافی کی بڑھتی ہوئی عوامی مقبولیت اور ترویج پر بات کرنا چاہتا ہوں۔

آج کے اخبار کی خبر ہے کہ امریکہ سے تعلق رکھنے والا، عالمی سطح پر سب سے مقبول اور بڑا کافی ہاؤس چین، سٹار بکس، جاپان میں ایک کاروباری ڈیل کرنے جا رہا ہے جس کی مالیت پاکستانی روپے میں ایک سو ارب بنتی ہے۔تفصیل کچھ یوں ہے کہ اس عالم رنگ و بو کی سب سے بڑی کافی شاپ کمپنی جس کی جاپان میں ایک ہزار سے زیادہ شاخیں ہیں، دیگر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرح اس کے بھی بازار میں حصص فروخت ہوتے ہیں، اس وقت سٹار بکس کی انتظامیہ کے پاس جاپان میں اس کے کاروبار کے انتالیس فیصد حصص کی ملکیت ہے۔خبر کے مطابق کمپنی نے اپنے بقیہ اکسٹھ فیصد حصص ایک سو ارب روپے میں خریدنے پر آمادگی ظاہر کردی ہے۔اس خبر سے ایک موٹی سی بات تو سمجھ میں آجاتی ہے کہ سٹار بکس کافی شاپ کی جاپان میں مجموعی مالیت دو سو ارب روپے کے آس پاس تو کہیں ہوگی، گو کہ آجکل مقبولیت کی دوڑ میں یہ قدرے آگے دکھائی دیتا ہے مگر پھر بھی بنیادی حقیقت تو

یہی ہے کہ سٹاربکس جاپان میں پائی جانے والی بہت ساری کافی شاپ کمپنیوں میں سے ایک ہے۔ اس سے آپ ملک میں کافی پینے والوں کی مجموعی تعداد اور مقدار کا شاید اندازہ لگا سکیں۔ ذرا ٹھہریے!! یہ تو صرف کافی بنا کر بیچنے والی دکانوں کا ذکر ہوا ہے، گھر اور دفاتر میں کافی کا استعمال ایک طرف رہا، یاد دلاتا چلوں کہ جاپان میں دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ وینڈنگ مشین پائی جاتی ہیں، وینڈنگ مشین کو "برقی دکاندار" کہہ لیں یا "آلہ فروخت " کیونکہ ابھی تک اس لفظ کا اردو ترجمہ نہیں ہوا ہے، اور اداراہ مقتدرہ قومی زبان کے خاتمے کے بعد اس کا امکان بھی معدوم ہے، اس لیے ہم اب اپنی پسند کا ترجمہ کرنے میں آزاد ہیں۔ بہر حال ان کی تعداد جاپان میں پچاس لاکھ سے زائد ہے، اور ان پر روزمرہ ضروریات کی بہت ساری چیزیں دستیاب ہیں، ادھر سکہ مشین کے اندر ڈالا، ادھر سامان مشین سے باہر آ گیا۔ ایسی مشینوں پر نوے فیصد قریبا مشروبات اور ٹکٹ فروخت ہوتے ہیں۔ مشروبات میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا مشروب اگر بلیک کافی نہیں بھی، دودھ ملی، شکر والی، ٹھنڈی، گرم کافی کی تعداد جمع کر لیں تو بلاشبہ سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہے۔ آپ کو یہ پڑھ کر یقینی طور پر حیرت ہوگی، اگر میں بتا دوں کہ اربوں ڈالر سالانہ کی فروخت کا حامل کافی کا مشروب کچھ سال پہلے تک جاپان میں اجنبی اور پردیسی سمجھا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں آپکو ایک واقع سناتا ہوں جس سے شاید مشروبی ذوق کی تبدیلی کا اندازہ ہو سکے گا۔

یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ٹوکیو نہ صرف کرہ ارض پر واقع سب سے گنجان آباد شہر ہے، بلکہ اس دیس کی آبادی کا کم وبیش پانچواں حصہ اس شہر اور اس کے مضافات میں رہائش پذیر ہے، "گریٹر ٹوکیو" کہلانے والے اس نگر کے ڈاؤن ٹاؤن بھی کوئی سات بنتے ہیں، جو شاید ہی دنیا کے کسی اور شہر کے ہوں گے، کاروباری ڈاؤن ٹاؤن "شن جیکو" کہلاتا ہے، اس

کی راتیں بھی روشن ہوتی ہیں، وقت کا تعین یہاں ٹریفک کے بہاؤ اور لوگوں کی آمد ورفت دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا، دن اور رات کا فیصلہ گھڑی کی سوئیاں اور آسمان کی سفیدی وسیاہی فقط کر سکتی ہے۔ اسے ریڈ لائیٹ ڈسٹرکٹ سمجھتے ہیں۔

نوے کی دہائی کے ابتدائی سالوں کا ذکر ہے، آسٹریلیا سے میرے بڑے بھائی سے ملنے ان کے ایک دوست یہاں آئے ہوئے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد اس دوست نے کافی پینے کی فرمائش کر دی، ہمارا مرکزی دفتر بھی ٹوکیو کے مذکورہ بالا علاقے میں واقع ہے، بھائی جان آسٹریلیا سے آئے مہمان کو لیکر کافی ہاؤس کی تلاش میں نکلے، بعد از تلاش بسیار پورے ''شن جیکو'' میں ایک کافی شاپ نظر آئی، اس نے بھی کافی کے فی کپ کا تین ہزار روپیہ وصول کیا، آج اسی علاقے میں بلا مبالغہ سینکڑوں کافی ہاؤس ہوں گے، کافی کا وہی کپ آجکل دو، چار سو روپے سے زیادہ کا نہیں ہے اور وینڈنگ مشین میں تو کافی کا کین ہو یا پھر کوئی دوسرا مشروب ایک سو بیس ین کے سکے ڈالنے سے نکل آتا ہے۔

امریکی ریاست سیاٹل سے شروع ہونیوالی سٹاربکس کافی شاپ جاپان میں خاصی تاخیر سے پہنچی تھی۔ پہلی شاخ کا افتتاح کہیں 1996ء میں ہوا تھا۔ اب اس کے چیف فنانشل آفیسر نے سرمایہ کاری کانفرنس سے خطاب میں کہا ہے ہماری خواہش ہوگی کہ جاپان میں بڑھوتری کے زبردست مواقع سے فائدہ اٹھایا جائے کیونکہ ایسی مارکیٹ کافی کے لیے اور کوئی دوسری نہیں ہے۔

ایتھوپیا کے قبائلی چرواہے نے صدیوں پہلے یہ محسوس کیا تھا کہ اس کے ریوڑ بھیڑ ،بکریاں جب کافی کے دانے کھاتی ہیں تو مستی وسرور میں آکر اٹکھیلیاں کرنے لگتی ہیں، اس نے ایک دن تجسس سے مغلوب ہو کر کافی کے کچھ بیج کھائے تو خود بھی اپنے بدن میں چستی سی محسوس کی، بات قبیلے کے باقی لوگوں تک پہنچنے کے بعد دیگر قبائل تک بھی پہنچ گئی، نتیجتاً جلد

ہی کافی افریقی قبائل کی پہلے غذا کا حصہ اور پھر محبوب مشروب بن گیا۔فرانسیسی ایتھوپیا پر قبضہ کرنے کے بعد کافی کو یورپ لیکر چلے گئے۔کافی کو بھون کر پیسنا اور پھر پیا یورپی لوگوں نے شروع کیا تھا۔کاپے چینو کافی کے ساتھ تو خیر ہم مسلمانوں کی ایک تاریخی نسبت ہے۔ جب سپین میں مسلمان شکست کھا کر بھاگ گئے تو اپنے پیچھے کافی کی بوریاں چھوڑ گئے تھے، عیسائی جنرل نے اس کافی کو پسوایا اور گرم دودھ میں ملا کر اپنے فوجیوں کو فتح کے خصوصی مشروب کے طور پر پیش کیا۔فوجیوں نے اسے مشن جان کر جشن فتح برپا کیا۔اس فاتح سپاہ سالار کا نام جنرل کاپے چینو تھا، دودھ ملی کافی کا نام بعد ازاں اسی سے منسوب ہوگیا۔ افریقی چرواہے کی اس دریافت نے باقی عالم فتح کرنے کے بعد گزشتہ چند سالوں میں یہاں بھی کامیابی کے ایسے جھنڈے گاڑے ہیں، کہ اب جاپان جیسے روایتی مشرقی ملک میں بھی کافی کے بغیر روزمرہ زندگی کا تصور محال ہے۔
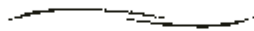
# ہاچیکو—وفا کی علامت

انسان کی محبت میں جنگل کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے والے جانوروں میں کتا غالباً اوّلین ہے۔ کتے اور گھوڑے نے جنگل کو ایسا چھوڑا کہ پھر کبھی واپس نہیں پلٹے اور انسانی آبادیوں کو ہی اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔ قرآن مجید میں اصحاب کہف کے واقعے سے ایک ثبوت یہ بھی ملتا ہے کہ کتا ہزاروں برس سے انسانوں کا پالتو جانور ہے۔ ہڑپہ، موہنجوداڑو سے ملنے والے آثار سے پتا چلتا ہے کہ وادی سندھ میں پانچ ہزار سال قبل یہ جانور جنگل چھوڑ کر انسانی بستیوں میں آباد ہو چکا تھا۔

خبر تو یہ ہے کہ گزشتہ روز جاپان کے مشہور زمانہ کتے ''ہاچیکو'' کا اپنے مالک سے اظہار محبت کرنے کا ایک انداز مجسمے کی صورت میں ڈھال کر ٹوکیو یونیورسٹی میں نصب کیا گیا ہے۔ اس مجسمے کی تقریب رونمائی کی تفاصیل سے پہلے یہ تعارف ضروری ہے کہ ''ہاچیکو'' کون تھا۔ اپنی موت کے اسی سال بعد بھی وہ اتنا اہم کیوں ہے؟ کہ اس کی برسی منانے کے لیے جاپان کی سب سے معتبر یونیورسٹی کے شعبہ زراعت میں اس مجسمے کو نصب کیا جا رہا ہے۔ جو کہ اس کتے کا پہلا یا واحد مجسمہ نہیں ہے۔ کئی شہروں کے ریلوے اسٹیشنوں پر آپ کو ''ہاچیکو'' کا

مجسمہ ایستادہ نظر آئے گا۔ فلموں کے شوقین حضرات اس کتے سے یقیناً متعارف ہوں گے، کیونکہ اس پر ہالی ووڈ کی ایک مقبول بلاک بسٹر فلم بھی بن چکی ہے، جس میں معروف آسکر ایوارڈ یافتہ اداکار رچرڈ گیئر نے ہیرو کا کردار ادا کیا ہے، اس کتے کی زندگی پر بنائی گئی ''ہاچی'' نامی اس فلم میں بنیادی حقائق تو وہی ہیں مگر زیب داستان اور فلم کی ڈیمانڈ کے مطابق کچھ تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔

کتے کی اپنے مالک سے وفاداری کے اس تاریخی واقعے کا آغاز سن 1924ء میں ہوتا ہے، جب ٹوکیو یونیورسٹی کا پروفیسر اوینو بھورے اور سفید رنگ کا ایک کتا خریدتا ہے۔ وہ اسے ہاچیکو کا نام دیتا ہے، جس کی عمر ایک برس کے لگ بھگ ہے۔ پروفیسر اوینو جاپان میں جدید آبپاشی نظام اور دیہی ترقی کے شعبے کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے، جب وہ یونیورسٹی سے پڑھا کر واپس گھر لوٹتا تو قریبی لوکل ریل اسٹیشن پر اس کا یہ پالتو کتا اسے خوش آمدید کہنے کے لیے آنے لگا۔ پھر روزانہ کا معمول ہوگیا کہ جب پروفیسر یونیورسٹی سے فراغت کے بعد ٹرین پکڑ کر گھر کے قریبی شبیا اسٹیشن پر پہنچتا، تو اسٹیشن کے باہر ''ہاچیکو'' کو اپنا منتظر پاتا۔ پھر دونوں وہاں سے پیدل گھر تک کا سفر اکٹھے طے کرتے۔ یہ معمول ایک سال تک جاری رہتا ہے۔ پروفیسر کی سن 1925ء میں ناگہانی موت ہو جاتی ہے۔ مگر اس کا پالتو کتا ''ہاچیکو'' اگلے 9 سال 9 مہینے اور پندرہ دن تک ٹوکیو کے شبیا اسٹیشن پر اپنے مالک کا انتظار کرتا ہے، اور روزانہ بلاناغہ شام کو جب وہ ٹرین پہنچتی، جس پر اس کا مالک پروفیسر گھر لوٹتا تھا، ہاچیکو بے چین ہو جاتا۔ پہلے پہل تو لوگوں کا عمومی رویہ ''ہاچیکو'' کے ساتھ غیر دوستانہ تھا مگر آہستہ آہستہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ہاچیکو اپنے مرحوم مالک کا منتظر ہے۔ سن 1932ء میں کتوں کے بارے میں تحقیق کرنے والے ایک نوجوان محقق کا ''ہاچیکو'' کے بارے میں جاپان کے سب سے معتبر اور کثیر الاشاعت اخبار میں مضمون شائع ہوتا

ہے، یہ نوجوان پہلے بھی ''ہاچیکو'' کی نسل کے بارے میں جسے ''اکیت'' کہا جاتا ہے۔ کئی مضا مین لکھ چکا تھا۔ پھر ایک کے بعد ایک مضامین اخبارات میں ''ہاچیکو'' کے موضوع پر شائع ہونے لگے۔ وہ اپنی زندگی میں ہی وفا کی علامت بن چکا تھا۔ جنگ عظیم دوم میں ''ہاچیکو'' کو شہنشاہ سے وفاداری کے ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

اپنے مالک کی آمد کا دس سالہ انتظار ہاچیکو کی موت کے دن 1935ء میں ختم ہوتا ہے۔ گیارہ سالہ زندگی پانے والے اس غیر معمولی وفادار کتے کو نیشنل میوزیم آف سائنس ٹوکیو میں حنوط کر کے رکھا گیا ہے۔ اس کی یاد میں ہر سال آٹھ اپریل کو سالانہ یادگاری تقریب کا اہتمام ٹوکیو کے شبیا اسٹیشن پر کیا جاتا ہے۔ جس میں بلا مبالغہ سینکڑوں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ اسی اسٹیشن کے باہر پیتل کا ایک بہت بڑا مجسمہ ہاچیکو سے منسوب ہے دوسری جنگ عظیم میں ہاچیکو کے مجسمے کو نقصان پہنچا تو جس آرٹسٹ نے پہلا مجسمہ بنایا تھا اسی کے فرزند نے 1948 میں ہاچیکو کا نیا مجسمہ بنایا جو کہ اب تک اسٹیشن کے باہر ایستادہ ہے۔ اسٹیشن کے داخلی دروازے کا نام بھی اسی سے منسوب ہے ''ہاچیکو گیٹ''۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں گزشتہ روز ہاچیکو اور پروفیسر کے مجسمے کی تقریب رونمائی میں پانچ سو افراد نے شرکت کی۔ تقریب میں شریک ایک رضا کار کا کہنا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ یہ مجسمہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان گہری محبت کی ایک علامت بن جائے گا۔
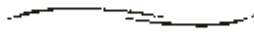
# سفید بالوں والوں کا ملک

جاپان سفید بالوں والے لوگوں کا ملک بنتا جا رہا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ
آبادی کی اکثریت خضاب کا استعمال کرتی ہے، مگر پھر بھی ضعیف العمری کے اپنے تقاضے
اور مظاہر ہوتے ہیں۔ تازہ ترین مردم شماری کے مطابق جاپان کی مجموعی قومی آبادی میں
گزشتہ پانچ برس کے دوران دس لاکھ افراد کی کمی ہوگئی ہے۔ اس خبر نے ملک کے سنجیدہ
حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی ہے، چونکہ یہ زمانہ امن میں آبادی میں کمی کا رجحان ریکارڈ
کیا گیا ہے۔ ریاست کو گزشتہ پانچ برس میں نہ تو کوئی جنگ درپیش تھی اور چند سال پہلے
آنے والے زلزلے و سیلاب میں ہلاک ہونے والے کچھ ہزار افراد کو اگر نظر انداز کر دیا
جائے تو کوئی بڑی قدرتی آفت بھی آبادی میں کمی کا سبب نہیں بنی ہے۔ شہریوں کو جدید طبی
سہولیات کی باآسانی فراہمی اور صحت کے شعبے میں ہونے والی ترقی کے سبب اوسط عمر بڑھی
ہے، کم نہیں ہوئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار پر غور کریں تو تمام تر قدرتی آفات و ناگہانی
واقعات کے باوجود ملک کے باشندوں کے زندہ رہنے کے امکانات میں مسلسل اضافہ

دیکھنے میں آ رہا ہے۔ عہد ساز سخن طراز ابنِ انشاء کا یہ قول اپنی جگہ معتبر سہی کہ ’’جھوٹ کی تین اقسام ہوتی ہیں، اوّل جھوٹ، دوم سفید جھوٹ اور سوم سرکاری اعداد وشمار، جھوٹ کی قسم کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ یہاں صورت حال بالکل برعکس ہے۔ سرکاری اعداد وشمار اور اطلاعات کو عوامی سطح پر زیادہ معتبر مانا جاتا ہے، اور حقیقتاً وہ زیادہ قابل اعتماد ہوتے بھی ہیں۔

آبادی میں کمی کی سب سے اہم اور کھلی وجہ تو کم شرح پیدائش ہی ہے۔ پانچ سال پہلے کی گئی مردم شماری کے مطابق بارہ کروڑ تہتر لاکھ افراد جاپان میں زندگی گزار رہے تھے، جبکہ اس ماہ شائع ہونے والے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ایک ملین افراد کی کمی کے بعد، اب اس ملک کے باسیوں کی تعداد بارہ کروڑ چونسٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ آبادی کے لحاظ سے جاپان اب بھی دنیا کا گیارہواں بڑا ملک ہے اور اس عالم رنگ وبو میں سانس لینے والے انسانوں کی کل تعداد میں سے قریباً دو فیصد یہاں آباد ہیں۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ اگر آبادی میں کمی کا یہی تناسب جاری رہا تو اقوام متحدہ کے تخمینوں کے مطابق 2050ء تک جاپان کی آبادی محض 10 کروڑ نفوس تک محدود ہو جائے گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1955ء میں اس ملک کی آبادی 9 کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔

کم شرح پیدائش کی وجوہات پر غور کریں تو ہمیں گرتی ہوئی آبادی کے مسئلے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی سب سے اہم وجہ تو مہنگائی ہے۔ پچھلی دو دہائیوں کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیں، ہر سال دنیا کے مہنگے ترین دس شہروں میں جاپان کے دو تین شہر شامل ہوں گے۔ ٹوکیو اور اوساکا تو عموماً اس فہرست کے مہنگے ترین پانچ شہروں میں شامل رہے ہیں۔ ایسے مہنگے ملک میں بچے پالنا یقیناً بہت مہنگا ہے، اس لئے لوگ ایک دو بچوں کے بعد مہنگائی کے خوف کا اکثر شکار ہو جاتے ہیں۔ ملک میں قائم مثالی امن وامان اور جان ومال کا تحفظ جہاں بہت بڑی نعمت ہے، وہیں کم شرح پیدائش کی وجہ بھی ہے۔ عالمی

طور پر یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ جنگ زدہ علاقوں اور جنگ کے دوران شرح پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔آپ فلسطین اور افغانستان کی تازہ مثالیں ہی دیکھ لیں، اتنی بڑی مقدار میں جنگ کی وجہ سے ان علاقوں سے ہجرت ہوئی مگر آبادی میں کمی کی بجائے مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔عدم تحفظ کا احساس شرح پیدائش میں اضافے کا سبب ہے اور تحفظ اس شرح میں کمی کا باعث بنتا ہے۔

بڑے شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی، بہتر مستقبل کی تلاش میں چھوٹے قصبوں اور دیہات سے لوگ ترک سکونت کر کے شہروں میں منتقل ہورہے ہیں۔جاپان کی کل آبادی کا چھ فیصد اب دیہات میں زندگی گزاررہا ہے، جبکہ 94 فیصد لوگ شہروں کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔بڑے شہروں میں زندگی کی سہولیات یقیناً یہاں بھی زیادہ ہیں مگر زندگی زیادہ مصروف اور مہنگی بھی ہے، نیز شہروں میں رہائش گاہوں کا عمومی سائز اتنا چھوٹا اور مختصر سا ہے کہ اس میں بڑا کنبہ سمانا تو ممکن ہی نہیں ہے۔شہری زندگی اور رہائش گاہوں کا رقبہ بھی آبادی میں کمی کا کا اہم سبب ہے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ کوئی بھی ملک اور معاشرہ جتنا زیادہ مذہبی ہوگا اس میں آبادی میں اضافے کی رفتار بھی اتنی زیادہ تیز ہوگی۔یورپ، روس اور چین مذہب سے بیگانگی کی بڑی مثالیں شمار کی جاتی ہیں، اور ان میں آبادی کے بڑھنے کی شرح بھی بہت ہی کم ہے۔غالباً توکل، ایثار اور صلہ رحمی خالصتاً مذہبی معاشرے سے منسوب چیزیں ہیں، جیسے جیسے مذہب سے دور ہٹتے جائیں، یہ دوسرے لوگوں پر احسان اور قربانی کے جذبات بھی ماند پڑتے جاتے ہیں، ان کی جگہ خودغرضی لے لیتی ہے۔حضور پاکؐ کا بڑا ہی خوبصورت فرمان ہے، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ''جو کھانا ایک شخص کا پیٹ بھر سکتا ہے، وہ دو افراد کی شکم پروری کے لئے بھی کافی ہے''۔اگر کوئی مجھ سے جاپانیوں کی مذہبی عبادات اور رجحانات

کے بارے میں پوچھے تو یہ پریشان کن سوال ہوگا۔اس معاشرے میں روحانیت کے اثرات تو بہت گہرے ہیں مگر مذہب اور مذہبیت سے یہاں کے لوگ کافی دور ہیں۔گرتی ہوئی آبادی کی وجہ یہ بھی ہے کہ معاشرہ مذہب سے دور ہوتا جارہا ہے۔سوسال سے زیادہ عمر کے حامل افراد کی سب سے زیادہ تعداد اسی ملک میں ہے۔کم عمر اور زیادہ توانا لوگ محنت کی منڈی میں نسبتاً کم ہوتے جارہے ہیں۔ملکی باشندوں کی اس وقت اوسط عمر 47 سال ہے۔

آبادی میں کمی کے رجحان اور اس کے اثرات کو سب سے نمایاں طور پر زرعی شعبے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ملکی زراعت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس شعبے سے منسلک افراد کی تعداد بیس لاکھ سے بھی نیچے چلی گئی ہے۔یوں تو کئی عشروں سے جاپان میں زراعت کا شعبہ بوڑھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے،مگر وزارت زراعت کے مطابق اتنے شدید بوڑھے تو کسان بھی نہ تھے۔یعنی 67 فیصد کسانوں کی عمر اب 67 برس سے بھی زیادہ ہے۔ملک میں مجموعی طور پر زیرکاشت رقبہ مسلسل کم ہوتا جارہا ہے۔گزشتہ پانچ سالوں میں زراعت سے روزی،روٹی کمانے اور اس شعبے پر زندگی کا انحصار کرنے والے افراد کی تعداد میں چودہ فیصد کمی ہوئی ہے۔اب زرعی شعبے سے متعلق افراد کی تعداد محض سترہ لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔باقی شعبہ ہائے زندگی میں بھی گھٹتی ہوئی آبادی کے اثرات محسوس کئے جارہے ہیں،گرچہ زرعی شعبے میں یہ زیادہ شدید ہیں۔پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی اور آبادی کے کنٹرول پر توبات ہوتی ہے مگر یہ نقطہ نظر سامنے نہیں آیا کہ بڑی آبادی،بڑی افرادی قوت کا مظہر اور ترقی کا زینہ بھی ہے۔ہمارے ملک کے وسائل کے مطابق یقیناً بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول ضروری ہے مگر جاپان میں معاملہ الٹ ہے،گرتی ہوئی آبادی مسئلہ بنی ہوئی ہے۔
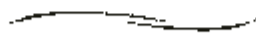
# مجموعی معیاری پیداوار کا جاپانی تصوّر

معیشت کے شعبہ میں پیداوار کے معیار کو یقینی بنانے کا نظام گزشتہ چند دہائیوں میں دنیا بھر میں بہت مقبول ہوا ہے۔ معیاری پیداوار کے اس نظریے کو صنعتی اداروں میں بالخصوص بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ٹوٹل کوالٹی مینجمنٹ یا (T.Q.M) کے نام سے مشہور اس نظام کو عالمی سطح پر اہمیت ملنا قابلِ فہم اور منطقی بھی ہے۔ دنیا بھر میں پیداواری اداروں کی پیداوار کے معیار کو جانچنے کے لیے بہت سارے ادارے اور کئی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ برآمدات کے شعبے سے وابستہ پاکستانی جانتے ہیں، کہ اگر یورپ، امریکہ یا کسی بھی امیر ملک میں پاکستانی مصنوعات بھیجنا چاہیں تو عموماً اولین سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کے ادارے کے پاس پیداواری معیار سے متعلق کیا فلاں سرٹیفیکیٹ موجود ہے؟ اگر ایک ادارے کا نہیں تو پھر دوسرے کا؟ درآمد کنندگان بڑی تسلی سے پہلے یہ تصدیق کرتے ہیں کہ کون سی معیار سے متعلق کام کرنے والی تنظیم پیداواری ادارے کے تیار کردہ مال کے معیاری ہونے کی ضمانت فراہم کر رہی ہے، اس کے بعد خریداری کا مرحلہ آتا ہے۔ اس

بابت بہت سارے عالمی سطح پر صنعتی اور تجارتی ایوارڈز بھی قائم کیے گئے ہیں ۔میڈیا میں مصنوعات کے اشتہارات کے ساتھ آپ کی توجہ اس طرح کے ایوارڈز کے تذکروں نے بھی یقیناً حاصل کی ہوگی۔

پیداواری معیار کو یقینی بنانے کا جاپانی تصور باقی دنیا سے ذرا منفرد نوعیت کا ہے۔ مجموعی پیداوار کو معیاری بنانے کا ضامن یہ نظام اس قدر اہم ہے کہ پاکستان سمیت دنیا بھر کی اعلیٰ درس گاہوں میں معیشت اور تجارت کے طلباء کو بطور مضمون پڑھایا جاتا ہے۔میں نے جن دنوں MBA کیا تھا، تو ہماری جماعت کے طلباء کو بھی یہ علم ایک الگ مضمون کے طور پر پڑھنا پڑا تھا، جس کا نام ہے۔

"Total Quality Management in Japanese Way" اشیاء کی مجموعی معیاری پیداوار یا T.Q.M کا جاپانی تصور بہت دلچسپ اور بے مثال ہے۔جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا، دنیا بھر میں کئی قابل بھروسہ ادارے ہیں جو کہ صنعت وحرفت کے شعبے میں معیار کو جانچنے کا کام کرتے ہیں۔جاپان میں مگر صرف صنعت ہی نہیں بلکہ پیداوار کے تمام شعبوں میں معیار کو پرکھنے اور قائم رکھنے کا ایک مربوط نظام موجود ہے۔

تمام عالم میں ہمیشہ سے ہی یہ رواج رہا ہے کہ صنعتی شعبے میں اشیاء کو پیداوار کے بعد اچھی اور بری کوالٹی میں بانٹ دیا جاتا ہے۔کہیں پر مصنوعات B،A کیٹیگری اور پھر مسترد شدہ مال میں بانٹی جاتی ہیں ۔کہیں کہیں ان کو زیادہ دلفریب ناموں کے ساتھ معیاری، نیم معیاری، غیر معیاری، ناقص، گھٹیا اور ناقابل فروخت اشیاء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔مصنوعات کے معیار کو جانچنے کا جاپانی تصور ذرا مختلف ہے۔ تفصیل اس کی مختصراً یوں ہے کہ یہاں پر مال کے معیار کی جانچ کو پیداوار کے آخری مرحلے پر نہیں ٹالا جاتا ، بلکہ پیداوار کے دوران ہر مرحلے پر معیار کے یقینی ہونے کی تصدیق کی جاتی ہے اور غیر معیاری

پرزے، حصے یا ٹکڑے کو فوراً ہی الگ کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹی وی بناتے ہوئے، یہاں اس کے ایک ایک بٹن، اسکرین، سوئچ، بلب، اور کل پرزے کی پیداوار کے ہر مرحلے پر الگ الگ جانچ پڑتال کی جاتی ہے، لہٰذا جب ٹی وی ان تصدیق شدہ پرزوں کی مدد سے اسمبل کیا جاتا ہے تو پھر اس کے غیر معیاری یا خراب ہونے کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔ بازار میں فروخت کے لیے پیش کرنے سے پہلے جب ٹی وی سیٹ کو چیک کیا جاتا ہے۔ تو اس کی تشکیل میں شامل ہر پرزہ پہلے ہی بارہا معیار کی کسوٹی پر پورا اتر کر آیا ہوتا ہے، اس لیے ان سے بننے والی چیز کا غیر معیاری ہونا محال ہے۔

پوری دنیا میں مجموعی معیاری پیداوار کے جاپانی تصور کی دھوم اور مقبولیت ایک طرف کر دیں، اب تو پاکستان کے بہت سارے صنعتی ادارے اس تصور کو اپنا چکے ہیں۔ کافی ایسے ہیں جو اس کو اپنانے کا سوچ رہے ہیں۔ اس کی وجہ بہت سادہ اور واضح ہے، اگر کوئی کاروباری ادارہ ہر سطح پر پیداواری معیار کی جانچ رکھتا ہے تو پھر آخری مرحلے پر اس کا مسترد مال بہت کم رہ جاتا ہے۔ یہ تصور فقط معیار سے محبت اور تحفظ کا نہیں بلکہ کاروباری منافع اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ پاکستان کے ایک فریج اور ائیر کنڈیشن بنانے والے ادارے نے چند سال قبل مذکورہ نظام اپنایا تھا۔ اس کمپنی کے مالک کا کہنا ہے کہ چند سالوں کے دوران اس کے مسترد شدہ مال کا تناسب پہلے کی نسبت بیس فیصد رہ گیا یعنی پہلے اگر ایک ہزار فریج بناتے تھے تو اس میں سے اوسطاً پچاس خراب نکلتے تھے۔ اب مجموعی معیاری پیداوار کے جاپانی طرز کو اپنانے کے بعد ایک ہزار میں سے بمشکل دس فریج خراب نکلتے ہیں۔ کیونکہ خراب پرزوں کو تو پہلے ہی ہر مرحلے پر الگ کر دیا گیا ہوتا ہے۔

جاپان میں آنے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ ہم درس گاہ میں مجموعی معیار کے متعلق جس جاپانی پیداواری تصور کو مضمون کے طور پر پڑھتے ہیں، وہ فقط پیداواری شعبے تک ہی

محدود نہیں ہے۔ بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں کارفرما ہے۔ سچ پوچھیے تو معیاری پیداوار کے اس طریقے کا بنیادی محرک کاروباری منافع نہیں، بلکہ یہ جاپانیوں کا طرز حیات ہے، جو کہ اتفاق سے صنعتی و معاشی شعبے میں آشکار ہورہا ہے۔ یہاں داغدار یا عیب دار چیز کی خرید وفروخت کو معاشرتی طور پر برا سمجھا جاتا ہے۔کسی چیز کا سستا ہونا بعد کی بات ہے،سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اسے معیاری ہونا چاہیے۔چین سے آئے ہوئے دوست بتاتے ہیں کہ جاپان میں فروخت ہونے والی چینی مصنوعات جس اعلیٰ معیار کی ہیں، وہ چین کے اندر چینیوں کو بھی دستیاب نہیں ہیں۔معیاری پیداوار کے جاپانی تصور کے پس منظر میں یہ سماجی شعور اور اجتماعی سوچ کارفرما نظر آتی ہے کہ اپنے کام کی انجام دہی میں غلطی کا امکان صفر ہونا چاہئے۔اس معاشرے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں غلطی کی گنجائش گوارا نہیں کی جاتی۔ معافی اور رحم کا جو تصور ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، وہ یہاں عنقا نظر آتا ہے۔پرانے وقتوں میں جب جاپان میں جاگیردارانہ نظام رائج تھا، بادشاہ کی زیرسرپرستی ملک کے طول وعرض میں ''سمورائی'' حکومت کرتے تھے،تب اگر کسی سے غلطی ہوجاتی تو وہ اپنا پیٹ تلوار یا خنجر سے چاک کرکے خودکشی کرلیتا تھا، جسے''ہاراکیری''یعنی پیٹ چاک کہا جاتا رہا ہے۔اب بھی مافیا کے ارکان جنہیں ''یاکوزا'' کہا جاتا ہے،اگر کوئی غلطی کرے تو اسے اپنی ایک انگلی،یا پھر انگلی کا حصہ کاٹنا پڑتا ہے۔غلطی کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے یہاں ہر شعبہء زندگی میں معیار کی ہر مرحلے پر پڑتال کی جاتی ہے۔غلطی سے مبّرا ہونے کی کوشش کا یہی محتاط رویہ ہمیں پیداواری شعبے میں بھی نظر آتا ہے۔ورنہ عام جاپانی کے تو علم میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ ان کے پیداواری طریقے کو دنیا باقاعدہ درسی مضمون کے طور پر پڑھ رہی ہے، اس پر تحقیق اور تقلید کررہی ہے۔

# سبز گلاب

ایک جاپانی کسان کی نوجوان بیٹی نے ایک رات عجیب خواب دیکھا۔ عجیب اس لیے کہ پھولوں سے بھرے اس سپنے کا مرکزی نقطہ سبز رنگ کا گلاب تھا۔ گلاب کی دنیا بھر میں سینکڑوں اقسام پائی جاتی ہے اور بیسوں رنگ اس کلاسیکی پھولوں کو زیبائی بخشتے ہیں مگر سبز رنگ کا گلاب تو آج تک اس عالم رنگ و بو میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ دوشیزہ کے خواب کا دلچسپ حصہ یہ تھا کہ سبز رنگ کا یہ ایک پھول بازار میں ایک ہزار روپے میں فروخت ہو رہا ہے۔ لڑکی نیند سے جاگی تو اس نے اپنا یہ خواب من وعن اپنے کسان باپ کو سنا دیا جو کئی دہائیوں سے پھولوں کی کاشت سے منسلک تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کسان نے اپنی بیٹی کا یہ خواب، اپنے چار کاشتکار دوستوں سے مل کر سچ کر دکھایا، سالہا سال کی سخت مشقت، محنت اور تجربات سے گزرنے کے بعد کسانوں کی یہ پانچ رکنی ٹیم سبز رنگ کا گلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اس ماہ سبز گلاب کو نا صرف نمائش کے لیے پیش کیا گیا بلکہ تجارتی پیمانے پر اس کی فروخت بھی شروع کر دی گئی ہے۔ تقریباً ہر رنگ کے گلاب کے

ساتھ دنیا بھر میں اساطیر وابستہ ہیں۔جتنی کہانیاں،مفروضے،توہم اور اظہاریے اس پھول سے منسلک ہیں شاید ہی کسی اور گل سے جڑے ہوں۔زرد رنگ کا گلاب بیزاری جدائی کی خواہش کا اظہار بھی ہوسکتا ہے۔سرخ گلاب ہر دیس میں محبت اور خوشی کا رنگ سمجھا جاتا ہے۔گلابی اور سفید گلاب نیک خواہشات،پاک جذبات اور روحانیت کے لیے، ہمارے کلاسیکی ادب محبوب کے لبوں کی تازگی کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے۔میرا خیال ہے کہ سبز رنگ کا گلاب شاید امارت،خوشحالی اور ترقی کی علامت کہلائے گا۔

یورپ کا رواج بھی خوب ہے کہ گلاب کے پھول ہمیشہ طاق تعداد میں تحفتاً پیش کیے جاتے ہیں،ایک،تین،پانچ،سات، جفت تعداد میں گلابوں کا تحفہ منحوس خیال کیا جاتا ہے۔مرنے والوں کے جنازے اور آخری رسومات میں شرکت کرتے ہوئے ہمیشہ جفت تعداد میں گلاب کے پھول ہدیہ کیے جاتے ہیں۔پھول تو چاہے دنیا کے کسی بھی ملک کے ہوں،خوبصورت ہی لگتے ہیں مگر یہاں کے پھولوں میں ایک خرابی ہے۔ان میں خوشبو نہیں ہوتی،آپ سبزیاں اور درختوں کے پتے سونگھ لیں یا گلاب اور دیگر پھول،آپ کو انیس اور بیس کا فرق بھی معلوم نہیں ہوگا۔پاکستان جیسے خوشبودار پھول مجھے کہیں بھی نہیں ملے۔اس سے بڑا ظلم بھلا کیا ہوگا کہ یہاں مندروں،معبدوں اور قبروں پر چڑھائے جانے والے پھولوں پر خوشبودار پرفیوم چھڑکا جاتا ہے۔میرے خیال میں یہ بھگوان کے ساتھ کھلا دھوکا اور مردوں کے ساتھ فراڈ ہے۔باردیگر عرض کرتا ہوں کہ پھول پھر پھول ہیں،خوبصورت تو لگتے ہی ہیں۔عام لوگوں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔تاریخ بتاتی ہے کہ ہٹلر جیسے ظالم شخص کو بھی پھول پسند تھے اور وہ بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔روسی کمیونسٹ انقلاب کا معمار لینن سخت گیر مشہور ہے،مگر اس کے کوٹ پر ہمیشہ ایک پھول سجا ہوتا تھا،بعد ازاں یہ جنگلی پھول یورپی سوشلسٹ کارکنوں کے یونیفارم کا ضروری حصہ بن گیا،یہ پھول لینن کے ساتھ اس طرح نتھی ہوا کہ

اب بھی میں نے دیکھا ہے کہ کمیونزم کے مخالف روسی نژاد لوگ اس پھول کو دیکھ کر اکثر چڑ جا تے ہیں اور سوشلسٹ خیال رکھنے والے لوگ اب بھی اسے سینوں پر ٹانکتے ہیں۔

جارج برنارڈ شا کی اس بابت اپنی منطق تھی۔ پھولوں سے اسے بے حد پیار تھا مگر توڑنا وہ گوارا نہیں کرتا تھا۔ جس گھر میں وہ رہتا تھا اس کے لان میں پھول ہی پھول اگے ہوے تھے۔ ایک دن اس کا ایک دوست اس کے گھر ملنے آیا برنارڈ شا اسے لینے کے لیے خود دروازے پر آیا اور اپنا سارا مکان اندر سے دکھایا۔ دونوں جب سٹڈی روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو عزیز دوست برنارڈ شا سے کہنے لگا کہ ایک چیز دیکھ کر میں بہت حیران ہوا ہوں، تمہارا باغیچہ تو پھولوں سے لدا پڑا ہے لیکن تمہارے گھر کے کسی گلدان میں ایک بھی پھول نہیں سجا ہے۔ برنارڈ شا نے جواب دیا کہ مجھے تو بچے بھی بہت پیارے لگتے ہیں لیکن میں ان کا گلا کاٹ کر میز پر نہیں سجا سکتا۔ تزئین و آرائش کا یہ طریقہ مجھے پسند نہیں۔ یہ وضاحت کرتا چلوں کہ برنارڈ شا سے مراد یہاں برطانوی دانشور، مصنف اور فلسفی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ ہمارے دوست عدنان شیرازی کے بقول، سیالکوٹ ڈگری کالج میں انگریزی کے ایک فاضل پروفیسر نے ایک ہونہار طالب علم سے پوچھا کہ برنارڈ شا کون ہے؟ طالب علم کا جواب تھا ''سر جی وہ ضرور علی پور سیداں کے سادات میں سے ہی کوئی ہوگا''۔ جوکہ ہمارے شاہ جی کا آبائی علاقہ بھی ہے۔

خواب کی بات ہو رہی تھی، متذکرہ جواں سالہ کسان زادی نے اپنے خواب میں جو سبز رنگ کا گلاب دیکھا اس کا ایک نام بھی تھا ''کونکو سارے'' جو ایک ہزار روپے کے عوض بازار میں ایک عدد پھول فروخت ہو رہا تھا۔ تازہ ترین احوال یہ ہے کہ لڑکی کے والد نے دیگر چار کسانوں کے ساتھ مل کر جنہوں نے سبز رنگ کے گلاب کو خواب سے حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ وزارت زراعت میں اس پھول کو ''کونکو سارے'' کے نام سے رجسٹرڈ

کرنے کی درخواست دائر کردی ہے۔ گویا اس کا خواب حرف بہ حرف حقیقت بننے جا رہا ہے۔ سبز لباس پہن کر پیدا ہونے والی گلاب کی یہ قسم ''سپرے گلاب'' کہلاتی ہے۔ جس میں نوک شاخ پر ہمارے دیسی گلاب کی طرح واحد پھول کی بجائے پھولوں کا ایک گچھا لگتا ہے۔ سبز رنگ کے گلاب کا تصور پیش کرنے والی خاتون کے والد کا کہنا ہے کہ جب میں نے مذکورہ خواب سنا تو میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ اگر میں اسے پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ پھول بہت زیادہ فروخت ہوگا کیونکہ میں نے بھی اپنی زندگی میں سبز گلاب نہیں دیکھا تھا۔ آج یہ سبز گلاب حقیقت بن کر ٹوکیو سمیت کئی شہروں میں پھولوں کی دکانوں پر دستیاب ہے۔ اور عام پھولوں سے دگنی قیمت پر فروخت بھی ہورہا ہے۔ پھول کی کامیابی ہی غالباً اس کی گراں قیمت کی وجہ ہے۔ چونکہ ابھی تک ضلع آئیچی کے فقط مذکورہ پانچ کاشتکار ہی تجارتی بنیادوں پر اسے کاشت کررہے ہیں۔ میرا شکوہ نما اعتراض تو اس پھول پر بس یہی ہے کہ یہ بھی یہاں کے دیگر پھولوں کی طرح خوشبو سے عاری ہے۔
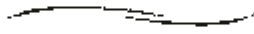
# زندگی کا سرچشمہ

تین سال پورے ہونے کو آئے ہیں جب جاپان کی تاریخ کا بدترین زلزلہ اور سونامی، ایک ساتھ ناگہانی آفت بن کر آئے۔ زلزلے اور سونامی سے شدید طور پر متاثرہ علاقوں میں ایٹمی پلانٹ بھی اس تباہی کی زد میں آ گئے، اور ان سے تابکاری کا اخراج شروع ہو گیا، اس کا نتیجہ ایٹمی بحران کی صورت میں سامنے آیا جس نے کئی ماہ تک پورے ملک کو خوف کی لپیٹ میں لئے رکھا۔ تیس ہزار سے زائد انسانی جانوں اور اربوں ڈالر کی املاک خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانے والے اس حادثے کے اثرات کا اب تک مسلسل جائزہ لیا جا رہا ہے۔ وزارتِ صحت نے گزشتہ روز اسی بابت ایک رپورٹ پیش کی ہے جس میں 2011ء کے زلزلے، سونامی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ایٹمی بحران کے بچوں کے رویے پر اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس فکر انگیز تحقیقی رپورٹ سے ملک کے سنجیدہ حلقوں میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اس رپورٹ میں پیش کئے گئے سروے کے مطابق آفت زدہ علاقوں سے

تعلق رکھنے والے بچوں میں سے ہر چوتھا بچہ ابنارمل رویے کا مظاہرہ کررہا ہے۔ مذکورہ آفت زدگی کے وقت تین سے پانچ سال کی درمیانی عمر کے حامل بچوں پر کیئے گئے سروے میں 25.9 فیصد بچے تشدد میں مبتلا، ناخن چبانے یا پھر دوسرے ابنارمل رویوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے پائے گئے ہیں جن کو اب طبی امداد کی ضرورت ہے۔ 2012-13ء کے دوران کیئے گئے اس تحقیقی سروے کے مطابق تین سال قبل آنے والی تباہی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے علاقوں کے ان نونہالوں کے اس غیر صحت مندانہ رویے کی وجوہات میں آفت زدگی کے دن، دوستوں کو کھودینا اور والدین سے بچھڑ جانا بھی شامل ہیں۔ قومی مرکز صحت و نگہداشت اطفال کے سربراہ، جو کہ اس تحقیقی ٹیم کے ممبر بھی تھے ،کا کہنا ہے کہ بچے شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ بچوں کے اہل خانہ اور ان کے اسکول والوں کو مل جل کر ان کی بحالی کی کوشش کرنی چاہئے اور ان پر مستقل نظر رکھنی چاہئے۔

بچپن میں پیش آنے والے حادثات و واقعات انسان کی شخصیت کو کس طرح متاثر کرسکتے ہیں، یہ بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ فرانس کا عہد ساز لیڈر نپولین بوناپارٹ صرف چھ ماہ کا تھا جب ایک جنگلی بلا آ کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا، ملازم جو کہ قریب ہی کھڑا تھا، اس نے بلّے کو فوراً بھگا دیا۔ اس چھوٹے سے واقعے نے بوناپارٹ کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ پر بہت گہرے اور دُور رس اثرات مرتب کئے۔ نپولین ساری زندگی بلیوں سے ڈرتا رہا، حالانکہ وہ تو شیر سے بھی بے دھڑک لڑنے والا آدمی تھا۔ 19ویں صدی کے آغاز میں پورے یورپ پر اس کی دہشت طاری تھی، رُوس اس کے خوف سے لرز رہا تھا، مگر انگلستان کے جنرل نیلسن کو نپولین بوناپارٹ کی کمزوری کا پتہ تھا، واٹرلو کی جنگ کے ہنگام میں برطانوی جنرل نے 70 جنگلی بلے اپنے لشکر کے آگے باندھ لئے۔ میدان جنگ کا منظر عجیب تھا کہ آگے جنگلی بلے چل رہے ہیں اور ان کے پیچھے انگریزی فوج مارچ

کرتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔اس طرح نپولین بوناپارٹ نے پہلی مرتبہ کسی جنگ میں شکست کھائی۔ اپنی زندگی میں واٹرلو سے پہلے وہ ہر معرکہ جیتتا آیا تھا۔گو کہ اس کی شکست کی دیگر وجوہات بھی رہی ہوں گی مگر مورخین نے اس وجہ کو سب سے اہم اور بنیادی قرار دیا ہے۔

پاکستان کئی سال سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔اس خون ریزی کے ہمارے بچوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں،یہ شاید ہمارے کسی بھی فورم پر آج گفتگو کا موضوع نہیں ہے۔تشدد کے ماحول میں پرورش پانے والے یہ بچے جب کل پاکستان کی باگ دوڑ سنبھالیں گے،تو یہ کس قسم کا معاشرہ تشکیل دیں گے،یہ سوچ کر ڈر سا لگتا ہے۔ادب کا نوبل انعام پانے والی شاعرہ گبریلا مسترال عالمی سطح پر کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں،آج اُن کی تحریر کردہ ایک نظم بہت یاد آ رہی ہے،جس کا میں نے ہسپانوی زبان سے براہ راست اُردو میں ترجمہ کیا ہے،اس کا نام ''آج'' ہے:

ہم بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے ذمہ دار ہیں مگر ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے بچوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔زندگی کے چشمے کو بھلا رکھا ہے۔بہت سی چیزیں جن کی ہمیں ضرورت ہے انتظار کر سکتی ہیں،مگر بچے انتظار نہیں کر سکتے۔یہی وقت ہے جب ان کی ہڈیاں بن رہی ہوتی ہیں،ان کا خون بن رہا ہوتا ہے اور ان کے حواسِ خمسہ تشکیل پا رہے ہوتے ہیں،ان کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ''کل''۔کیونکہ اس کا نام ''آج'' ہے۔
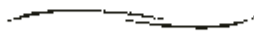
# دنیا کا بہترین سیاحتی مقام

موضوع اگر سیر وسیاحت کا ہو تو پھر عالمی سطح پر سب سے معتبر جریدہ ٹریول اینڈ لیبر میگزین مانا جاتا ہے۔ ہر مہینے امریکہ سے دس لاکھ کاپیاں شائع ہو کر دنیا بھر کے ممالک میں تقسیم ہونے کے سبب اس ماہنامے کے سب سے کثیر الاشاعت ہونے میں بھی کوئی شک نہیں رہتا ہے۔ گزشتہ بیس سال سے امریکی جریدے نے شہروں کی سالانہ فہرست شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اپنے تازہ ترین شمارے ''ٹریول اینڈ لیبر'' نے اپنے قارئین کے ووٹ کی بنیاد پر جو مقبول سیاحتی شہروں کے حوالے سے اپنی سالانہ فہرست شائع کی ہے۔ اس میں سیاحت کے لحاظ سے 2014 کے لیے بہترین مانے گئے نگروں میں جاپان کا شہر کیوٹو پہلے نمبر پر آیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ چڑھتے سورج کی سرزمین کا کوئی شہر سیاحت کی اس ''ٹاپ ٹین لسٹ'' میں اول نمبر قرار پایا ہے۔ دنیا بھر کے سیاحوں کے نزدیک اس شہر کو دیکھنے کی چاہت سب سے زیادہ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سال 2012ء سے پہلے کبھی جاپان کا کوئی شہر اس فہرست میں اپنی جگہ ہی نہیں بنا پایا تھا۔ ٹوکیو نویں نمبر سے ترقی کر کے پچھلے برس پانچویں پوزیشن اور اس سال فاتح عالم بن کر سامنے آیا ہے۔

شنٹو دھرم اور بدھ مت کی دس ہزار سے زائد عبادت گاہوں کو اپنے دامن میں جگہ دینے کے سبب، اسے معبدوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس شہر کی شہرت ما

حولیات کے تحفظ کے لیے اقوام عالم کے درمیان طے پائے جانے والے اس معاہدے کی وجہ سے ہے۔ جسے ''کیوٹو پروٹوکول کہا جاتا ہے''۔ کچھ عرصے پہلے پاکستانی ادیبوں کے وفد کے ہمراہ مجھے اس خوبصورت شہر کی تفصیلی سیاحت کا موقع ملا۔ اب جو دنیا بھر میں سیاحت کے لیے اس کو سب سے بہترین قرار دیا گیا ہے۔ تو میں نے سوچا کیوں نہ اس کے متعلق قارئین کرام سے کچھ گپ شپ ہو جائے۔ اس شہر کی اہمیت یوں بھی مخفی ہے کہ ٹوکیو کے دارالخلافہ بننے سے پہلے، یہ شہر ایک ہزار سال تک جاپان کا دارالحکومت رہا ہے۔ یہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھر سکتا ہے کہ جاپان کی اپنی عمر کتنی ہے؟ میرے ذہن میں بھی یہ سوال آیا تھا، میں نے یہ سوال قفلوں کی گمشدہ چابیاں بنانے والے ایک لاک ماسٹر سے پوچھا تھا۔ جو کہ میرا تقریباً دوست بن چکا تھا، دوست کے ساتھ تقریباً کی بدعت اس لیے ہے کہ اس نے آج تک میرے ساتھ کبھی کسی گاڑی کی گمشدہ چابی بنانے کا محنتانہ وصول کرتے ہوئے کوئی رعایت نہیں برتی، میرے سوال پر اس نے بہت سوچا مگر اس کی شاید تعلیمی قابلیت سے اوپر کی بات تھی اسی لئے اس نے اپنی گرل فرینڈ کو فون کیا جو کہ آج کل اس کی بیوی اور دو بچوں کی ماں ہے۔ میں تو سوال کر کے بھول گیا مگر لاک ماسٹر کو یاد رہا کوئی تین ہفتے گزرنے کے بعد وہ اپنی مبینہ منگیتر کے ساتھ میرے پاس آیا۔ خاتون خاصی پڑھی لکھی تھی، اس موضوع پر اس نے کافی تحقیق کی تھی، جس کا نتیجہ سنانے یہ جوڑا میرے دفتر آیا تھا۔ لاک ماسٹر کی منگیتر سے روایت ہے کہ جاپان، دو ہزار سال پہلے تو قطعی طور پر بحیثیت سلطنت موجود تھا، کچھ شواہد ایسے بھی ملتے ہیں کے بیس ہزار سال پہلے جاپان کی ریاست معرض وجود میں آ چکی تھی۔ گویا یہ دیس کم از کم دو ہزار برس اور زیادہ سے زیادہ بیس ہزار سال پرانا ہے۔ یہ قصہ بیان کرنے کا مقصد جاپان کی تاریخ کے بیان کے علاوہ وہ ثابت کرنا تھا کہ کیوٹو شہر کا ایک ہزار سال تک پیہم جاپانی دارالحکومت رہنے کا اعزاز کوئی، اندازہ تخمینہ یا تیر تکا نہیں بلکہ معتبر تاریخی حوالوں سے ثابت شدہ ہے۔ کیوٹو کا شاہی محل اسی دور کی یادگار

ہے جو یہاں کے معبدوں کے بعد سیاحوں کے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا سامان ہے جا پان کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ غیر ملکی کو پہلی نظر میں اس ملک کے تمام شہر ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ایک جیسی سڑکیں،عمارتوں کا طرزِ تعمیر،دکانیں،تعلیمی ادارے،ہسپتال حتیٰ کہ فطرت کے مناظر اور سب چہرے ایک جیسے نظر آتے ہیں،سب سے بڑھ کر اس یک رنگی کی مثال یہ ہے کہ پورے جاپان میں تیرہ کروڑ کی آبادی اور اڑھائی ہزار جزائر کے باوجود صرف ایک ہی زبان بولی جاتی ہے ہاں البتہ لہجے ضرور متنوع پائے جاتے ہیں۔مگر وہ بھی ایک درجن سے کم ہی ہوں گے مگر کیوٹو شہر باقی ماندہ جاپان سے تھوڑا سا مختلف لگتا ہے۔شا ید یہ انفرادیت بے سبب بھی نہیں ہے کہ اب تک اقوام متحدہ کا ادارہ یونیسکو اس شہر کے سترہ تا ریخی مقامات کو عالمی ورثہ قرار دے چکا ہے۔یہ تاریخی ورثہ کہنہ قلعے،عبادت گاہوں،باغات اور شاہی محلات پر مشتمل ہے۔ٹوکیو کا نیشنل میوزیم قابلِ دید ہے۔مگر اس شہر کی مجھے جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی ہے وہ بوٹینکل گارڈن ہے۔پندرہ لاکھ نفوس پر مشتمل یہ نگر صدیوں تک جاپان کا سب سے گنجان آباد شہر تھا،مگر وقت کے ساتھ ساتھ آبادی کے بہاؤ کے رجحان میں تبدیلی آئی،اس کی وجہ شاید دارالسلطنت ٹوکیو منتقل ہونا ہی تھا،پہلے اوساکا اور ٹوکیو نے اسے پچھاڑا اور اب یہ کھسکتے کھسکتے آبادی کے اعتبار سے کہیں دسویں نمبر پر جا پہنچا۔یوں تو جا پانی سلطنت کا دارالحکومت 1869ء میں شاہی عدالت کے ٹوکیو منتقل ہونے کے ساتھ ہی تبدیل ہو گیا تھا مگر کچھ آئینی ماہرین اور دانشوروں کا خیال ہے کہ قانونی طور پر اب بھی ٹوکیو جاپان کا اصلی دارالخلافہ ہے۔یہ ساری باتیں بھلے اپنی جگہ تسلیم شدہ ہوں مگر کیوٹو دنیا کا بہترین سیاحتی مقام قرار دیئے جانے پر جاپان کی قومی سیاحتی تنظیم نے بھی ایک دعویٰ کیا ہے کہ کیوٹو کو یہ اعزاز دلانے میں اس کی شہری مہم اور تعلقاتِ عامہ کلیدی کردار ہے قومی سیاحتی تنظیم کے ترجمان کے اس دعویٰ کو بھی باطل قرار نہیں دیا جاسکتا کہ میڈیا کا دور ہے۔

# ترقی کا راز

جاپان کی بے پناہ ترقی کا راز کیا ہے؟ بظاہر بہت سادہ اور گھسا پٹا سا پرانا سوال ہے، مگر پھر بھی نہایت اہم اور بنیادی سوال ہے۔ ہماری طرح ایشیا کا جو بھی ملک ترقی کرنا چاہتا ہے جاپان اس کے لیے مثال کی حیثیت رکھتا ہے، یہی سوال مجھ سے سرکٹ ہاوس خانیوال کے ہال میں میڈیا ہاوس کے صحافیوں کی جانب سے میرے اعزاز میں برپا کی گئی تقریب میں پوچھا گیا۔ اس وقت جو جواب بن پڑا میں نے وضاحت کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ بعد ازاں اس سوال پر میں تادیر سوچتا رہا کہ جاپان نے دوسری جنگ عظیم کے ملبے سے کیسے شکست کے بعد خود کو نکالا اور سرعت سے معاشی ترقی کر کے دنیا کے لیے ایک مثال بن گیا۔ غور کرنے پر مجھ پہ کھلا کہ رازکی تو اس ترقی کے سفر میں کوئی بات ہی نہیں ہے۔ بہت کھلی کھلی سی وجوہات ہیں جو اسے معاشی طور پر بام عروج پر لے گئی ہیں۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ صرف ایک جملے میں ہی بیان کر ڈالوں تو بھی کوئی دقت نہیں ہے۔ میں کہوں گا کہ

مستقل مزاجی سے سخت محنت اور محنت کا سماجی اعتراف اس خیرہ کن معاشی ترقی کا سبب ہے۔

یہ معاشرہ قائداعظم کے فرمان کام، کام اور کام کی عملی تصویر ہے۔محنت کے سماجی اعتراف سے میری کیا مراد ہے، یہ بات شاید میں اس ذاتی واقعے سے واضح کرسکوں گا۔

یہاں پر بھی تمام شاہراہوں پر ہماری موٹروے پولیس کی طرز پر تیز رفتار گاڑیوں کی پکڑ دھکڑ کے لیے پولیس کیمرے نصب کر کے چھپی بیٹھی ہوتی ہے، اور موقع واردات پر ہی جرمانہ بھی عائد کرتی ہے۔اس کے علاوہ جگہ جگہ تیز رفتاری کی روک تھام کے لیے مستقل خودکار کیمرے بھی نصب کیے گئے ہیں۔جو کہ تیز رفتار گاڑیوں کی خودبخود تصاویر کھینچ لیتے ہیں۔سڑک پر حد رفتار کی خلاف ورزی کرنے والی موٹروں کی نمبر پلیٹ سے پولیس ان کے مالکان کا پتہ معلوم کر کے انہیں نوٹس بھجوادیتی ہے۔ماضی میں تو نوٹس کے ہمراہ خودکار کیمرے کی کھینچی ہوئی تصویر بھی ڈاک کے ذریعے بھجوادی جاتی تھی، مگر بعض صورتوں میں ڈرائیوروں کے ساتھ غیر محرم کی موجودگی ازدواجی جھگڑوں کا باعث بن جایا کرتی تھی۔علاوہ ازیں طلاق کی بڑھتی ہوئی قومی شرح میں کمی کرنے کے ارادے سے اب پولیس یہ تصویر حد رفتار کی خلاف ورزی کرنے والوں کو تھانے طلب کر کے تنہائی میں دکھادیتی ہے، اور پھر معاملہ عدالت کے سپرد کردیا جاتا ہے۔چند سال پہلے میں بھی تیز رفتاری کے سبب ایک ایسے ہی خودکار کیمرے کی زد میں آ گیا تھا۔دن کا وقت تھا اس لیے فلیش لائیٹ کا بھی پتہ نہ چلا۔ اس کوتاہی کا علم تب ہوا جب دفتر میں پولیس کی جانب سے نوٹس آیا کہ فلاں دن، فلاں مقام پر آپ نے فلاں وقت حد رفتار کی خلاف ورزی کی تھی، اور آپ کی تصویر کھینچی جاچکی ہے، اس لیے اپنی پہلی فرصت میں تھانے تشریف لے آئیں۔تھانے پہنچا تو پولیس والے نے تیز رفتاری کرتے ہوئے کی میری تصویر دکھا کر مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ آپ ہی کی تصویر ہے؟ انکار کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ بڑی کلیئر فوٹو آئی تھی۔میرے اقرار پر معاملہ عدالت کے سپرد کردیا

گیا۔عدالت کی مقررہ تاریخ پر مجھے سیاہ رنگ کی سرکاری کار کی پچھلی سیٹ پر تمام ملزموں کی طرح بیٹھا کر پولیس اسٹیشن سے عدالت لے جایا گیا۔وکیل کے ہمراہ جج کے روبرو پیش کیا گیا۔ایسے لگا جج صاحب سینما ہال کے ٹکٹ گھر کھڑکی کی طرح بیٹھے ہوئے ہوں۔جج کا چہرہ نظر نہیں آسکتا تھا۔لکڑی کی کھڑکی کے اس پار سے جج صاحب کے صرف ہاتھ ہی دکھائی دیتے تھے۔مجھ سے اس نے صرف ایک سوال کیا، کہ جس وقت تم تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہے تھے،تو تم کہاں جا رہے تھے؟ کوئی ذاتی معاملہ طے کرنے جا رہے تھے یا پھر کام کے سلسلے میں محو سفر تھے؟ میں نے اس بے ضرر سے سول کا جواب دیا کہ ایک ذاتی نوعیت کے معاملے میں تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔جج صاحب نے مجھے ستر ہزار روپے جرمانہ کر کے وہ چر ہاتھ میں تھما دیا۔
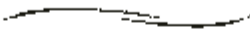
مجھے اس فیصلے پر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔اس حیرانگی کی وجہ یہ تھی کہ جب میں اپنی باری کے انتظار میں کمرہ عدالت میں بیٹھا تھا تو وہاں پر ایک برازیلی سے گپ شپ ہوئی۔جس نے میری طرح تیز رفتاری کے باعث ٹریفک کیمرے سے تصویر کھنچوائی تھی مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی رفتاری بھی میرے جتنی ہی تھی جب اکی خودکار کیمرے نے تصویر کشی کی۔عدالت میں جج کے روبرو مجھ سے پہلے وہ پیش ہوا تھا، اور اس پر چالیس ہزار روپے جرمانہ عائد کیا گیا تھا۔جب میں کمرہ عدالت سے باہر نکلا تو اتفاق سے کار پارکنگ میں مجھے وہی برازیلی لڑکا مل گیا۔میں نے اس سے استفسار کیا کہ یار! ہمارا جرم تو ایک جیسا تھا مگر ظالم جج نے مجھ پر جرمانہ تمہارے مقابلے میں زیادہ کیوں عائد کر دیا ہے؟ اس نے الٹا سول داغ دیا کہ تم نے جج کے سوال کا جواب کیا دیا تھا؟ میں نے کہا کہ یہی بتایا تھا ایک نجی مصروفیت کے سلسلے میں ایک جگہ جا رہا تھا۔یہ سن کر برازیلی نے مجھے کہا کہ تم نے غلطی کر لی۔اگر تم میری طرح یہ جواب دیتے کہ میں کام کے سلسلے میں کہیں جا رہا تھا تو تمہارا جرمانہ بھی

میری طرح کم ہی ہوتا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس طرح تو تمام ملک کے لوگ ہی یہ بیان دیں گے کہ وہ محنت، مزدوری اور کام پر نکلے ہوئے تھے، تو جناب عرض یہ ہے کہ جاپانی جھوٹ نہیں بولتے۔ میرا مطلب ہے کہ بالکل بھی اس فن سے ناآشنا ہیں۔

یہاں مجھے اپنے دفتر کے ہمسائے میں واقع الیکٹرک بیٹری بنانے والی کمپنی کا مالک بھی بار بار یاد آرہا ہے، جسے میں سالہا سال تک اس کمپنی کا مزدور سمجھتا رہا۔ کیونکہ جب وہ پہلی مرتبہ تعارفی ملاقات کے لیے آیا تو اس نے بتایا تھا کہ میں سامنے واقع فیکٹری میں کام کرتا ہوں، ہم ہمسائے ہیں۔ پھر گاڑیوں کی بیٹری لینے یا چھوڑنے کے لیے آتا تو خود ہی بیٹریاں اٹھا اٹھا کر اپنی گاڑی میں رکھتا اور نکالتا تھا۔ ہمارے ہاں مالک بھلا ایسے تھوڑی ہوتے ہیں۔ اس کے مالک ہونے کا انکشاف تو یوں ہوا کہ ایک دن میں اس کی فیکٹری میں چلا گیا۔ کیونکہ وہ مزدوروں کے لباس میں ملبوس تھا مگر سب ملازمین اسے ''ساچو'' یعنی باس کہہ کر پکار رہے تھے۔ پاکستانی حساب سے اسے ارب پتی کہوں تو کسر بیانی ہوگی۔ میرے مشاہدے کے مطابق پاکستانی لوگ جاپانیوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ ہمارے قدرتی وسائل بھی جاپان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ عالمی سطح پر کیے گئے کئی سروے بتاتے ہیں کہ دنیا کی ذہین ترین اقوام کے پہلے پانچ درجوں میں پاکستانی شامل ہیں۔

ہمارے قدرتی وسائل اور ہماری قوم کی ذہانت اپنی جگہ مسلم حقائق ہیں۔ مگر یہ چیزیں ترقی کی ضمانت نہیں ہوسکتی ہیں، کسی دانا کا قول ہے کہ ''ذہانت کچھ کچھ ہے اور محنت سب کچھ'' جو خالق کائنات ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردی جائے، وہ رب العالمین ایسی ناانصافی نہیں کرسکتا کہ خود محنت کرنے والی اقوام اور افراد کو ثمر بار نہ کرے، ان کی مزدوری کا صلہ عطا نہ فرمائے۔ ایسا تو اس کی رحمت اور بے نیازی سے ممکن ہے کہ کچھ اقوام کو بغیر محنت کے قدرتی وسائل سے مالا مال کردے، ایسے

وسائل جن کے بل بوتے پر زندگی کی آسائش پوری قوم کا مقدر بن جاتی ہیں، یہ کبھی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا کہ محنتی اقوام کو عروج حاصل نہ ہوا ہو۔ دنیا میں ترقی کا اصول مستقل محنت ہے اور یہ ایک کھلا راز ہے۔

# سالِ نو اور نیا دار الحکومت

نئے سال کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں آج کل ٹوکیو سمیت ملک بھر میں عروج پر ہیں۔ یوں تو عیسائی مذہب کے پیروکاروں کی تعداد کا تناسب کل آبادی کے ایک فیصد سے بھی کم ہے، مگر کرسمس اور سال نو کا تہوار یہاں بالکل اسی جوش وجذبے سے منایا جاتا ہے جیسا کسی بھی مسیحی اکثریت والے ملک میں مناتے ہیں۔ روشنیوں اور رنگوں کا ایک دریا سر شام بہنا شروع کر دیتا ہے۔ گو کہ چراغاں کی ابتدا نومبر کے آخر میں شروع ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ جنوری کے آخر تک چلتا ہے، مگر اس کا نقطہء عروج کرسمس اور نیو ایئر ہی ہے۔ جگہ جگہ کرسمس ٹری اور سانتا کلاز کے مجسمے سجے ہوئے ہیں۔ سرخ وسفید لباس میں ملبوس، سفید داڑھی اور عینک والے مہربان بزرگ سانتا کلاز کی سواری، جس میں بچوں کے لیے تحائف لدے ہوئے ہیں، یہ تحفوں بھری کوچ اور اس کو کھینچنے والے بارہ سنگھے جگہ جگہ رنگ وروشنیوں سے منور نظر آتے ہیں۔ بازار سے گزرتے ہوئے سرد ہواؤں کے ساتھ ان دنوں کرسمس اور نئے سال کے مدھر گیت دور ونزدیک سے سماعتوں سے ٹکراتے ہیں۔ کرسمس ٹری پر سجے لٹکتے

آرائشی تحفے، رنگ برنگے ربن میں لپٹے سرخ اور سبز ڈبوں میں بند اس کرسمس ٹری کے اردگرد بکھرے بہت سے مزید ارتحائف جنہیں بچے للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

کرسمس سیل سننے میں خالصتاً مغربی تہذیبی و معاشی معاملہ محسوس ہوتا ہے۔یہاں پر مگر کرسمس اور نیو ائیر سیل تو مغرب کو بھی پیچھے چھوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔پچاس فیصد قیمت میں کمی تو تقریباً ہر چیز میں ہی ہے، کئی جگہ یہ قیمت 70% سے 80% تک بھی کم کی گئی ہے۔کل یہ لوٹ سیل ایک چھوٹے سے جھگڑے نما ناخوشگوار واقعے کا سبب بھی بن گئی۔قصہ کوتاہ یوں ہے کہ میرے نیپالی دوست دور دھا پر سادنے یہاں کے ایک مشہور شاپنگ مال سے گزشتہ ہفتے مبلغ چودہ ہزار روپے میں ایک سویٹر خریدا۔ظاہر ہے اس قیمت میں خریدے گئے سویٹر کا واحد مقصد سردی سے بچنا تو نہیں ہوتا ہے۔کل ہمارا بدقسمتی سے اسی شاپنگ سنٹر جانا ہوا، متذکرہ دوکان پر پہنچے تو یہ دیکھ کر میرے نیپالی دوست کا دل بیٹھ گیا کہ وہاں لوٹ سیل لگی ہے اور گزشتہ ہفتے چودہ ہزار میں خرید کردہ اس کا سویٹر دن دیہاڑے تین ہزار روپے میں سر عام فروخت ہو رہا تھا۔ کلیئرنس سیل اپنی جگہ مگر میرا دوست بھی بہر حال برہمن بندہ ہے، فوراً بگڑ گیا، دوکاندار سے کہنے لگا کہ تم بڑے بے غیرت لوگ ہو۔شرافت اور وضع داری نام کی کوئی چیز تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔ سات دن میں ہی میرا چودہ ہزار کا سویٹر صرف تین ہزار روپے کا رہ گیا ہے۔اب سویٹر واپس لو یا پھر مجھے گیارہ ہزار روپے کا نقصان پورا کر دو۔دوکاندار سمجھدار تھا، اس نے منت سماجت اور وضاحت پر ہی اکتفا کیا۔سودا واپس نہیں لیا۔

رنگ و نور میں نہائے ٹوکیو کا ذکر کر رہے ہیں تو قارئین کے لیے اس شہر سے دارالحکومت کی منتقلی کی تجویز بھی ایک دلچسپ خبر ہو سکتی ہے۔گزشتہ کئی سالوں سے جاپان کے ارباب اختیار اس موضوع پر سنجیدگی سے محو گفتگو ہیں کہ دارالسلطنت ٹوکیو سے منتقل

کر کے ملحقہ ضلع میں بنا دیا جائے۔ اس تبدیلی کے خیال کی بنیادی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ماہرین ارضیات کے مطابق مستقبل قریب میں ٹوکیو شہر میں ایک بہت شدید زلزلے کا امکان ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے حاصل ہونے والی معلومات بتاتی ہیں کہ یہ شہر زلزلے کی فالٹ لائن پر ہے۔ دنیا میں ابھی تک زلزلے کی پیشین گوئی کرنے والا کوئی آلہ تو ایجاد نہیں ہو سکا ہے، مگر ارضیاتی ماہرین اس بات کا تعین کر سکتے ہیں کہ کون سے علاقے میں زلزلہ آنے کے کتنے امکانات ہیں جیسے برطانیہ میں کبھی بھی زلزلہ نہیں آتا اور نہ ہی اس بات کا مستقبل میں امکان ہے۔ یوں تو جاپان مجموعی طور پر ہی ایسی جغرافیائی محل وقوع کی سرزمین ہے جس کی بنیادوں میں زلزلے رچے بسے ہوئے ہیں، مگر پھر بھی ٹوکیو کے مضافاتی علاقے ابارا کی کو مجوزہ دارالحکومت کے طور پر اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ جغرافیائی اعتبار سے زیادہ محفوظ ہے، زلزلوں کی دست برد سے نسبتاً کم متاثر ہوتا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر یہ خیال پسند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دارالحکومت کو کم آبادی والے دور دراز علاقے میں ہی ہونا چاہیے، تاکہ عام لوگوں کی زندگی وی آئی پی آمدورفت سے متاثر نہ ہو۔ دوسری طرف وی آئی پیز کی سیکورٹی بھی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ٹوکیو دنیا کا سب سے گنجان آباد شہر ہے۔ چار کروڑ کی آبادی والے اس شہر کے قریب قریب بھی کوئی گنجان آباد نہیں، چاہے دہلی، میکسیکو سٹی ہو یا پھر شنگھائی، ان سب کی آبادی ٹوکیو سے قریباً آدھی ہے۔ ٹوکیو کنکریٹ کا جنگل ہے۔ پست و بالا کنکریٹ کی عمارتوں کے درمیان اسفالٹ سے بنے ہوئے پر پیچ راستے ہیں۔ اس شہر کی اکثریتی آبادی چھوٹے چھوٹے فلیٹ نما گھروں میں رہتی ہے، ان رہائش گاہوں کا عمومی سائز اندرون لاہور شہر میں گھروں کی چھتوں پر کبوتروں کے لیے بنے ڈربوں سے ملتا جلتا ہے۔ مگر طرز تعمیر کی مہارت دیکھیے کہ اتنی سی محدود جگہ میں بھی گھر کی بنیادی ضروریات فراہم کر دی جاتی ہیں۔ کچن، غسلخانہ

بمعہ بیت الخلاء اور بالکونی، باقی ماندہ گھر میں دو چار پائیاں با آسانی بچھ سکتی ہیں۔ شہر بھر کی زمین کو بڑی بچت اور ہوشیاری سے استعمال کیا گیا ہے۔ کنکریٹ اور اسفالٹ سے بچ رہنے والی جگہوں پر ریل کی پٹریاں بچھی ہیں۔ اس شہر میں بیکار جگہ کا ایک انچ بھی نہیں ملے گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے ذہن میں ٹوکیو کا بڑا خوفناک اور گھٹن سے بھرپور تصور ابھر رہا ہو گا۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بارشوں کی کثرت کے سبب سبزہ وافر ہے۔ فضائی آلودگی نام کی کسی چیز کا تصور نہیں کیونکہ شہر کے لوگ صفائی کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ایسی صاف ہوا میں سانس لینے کی سہولت دنیا کے چند ہی ممالک کے باشندوں کو حاصل ہے جیسی شفاف فضاء میں ٹوکیو کے لوگ سانس لیتے ہیں۔ سبزے کی کمی کو پورا کرنے کیلئے لوگوں نے چھتوں پر باغیچے بنا رکھے ہیں۔ ''بام باغ'' جسے ہم چھت کا گلشن بھی کہہ سکتے ہیں، خالصتاً ٹوکیو کا دیا ہوا خیال ہے۔ ہمارے عہد کے سب سے بڑے ماہر تعمیرات کا یہ قول ہے کہ فن تعمیر خالی جگہ کی بابت علم ہے۔ اس مقولے کو یہاں میں اس لیے دہرا رہا ہوں کہ آپ بیکار جگہ سے مراد خالی جگہ نہ لے لیں۔ میرا مطلب یہ بتانا ہے کہ ٹوکیو میں جگہ کا زیاں بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اتنا گنجان آباد اور محدود رقبے کے باوجود یہ شہر کشادہ کشادہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر دارالحکومت اس شہر سے تبدیل کیا گیا تو یہ پہلا موقع نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے بھی جاپان کا دارالسلطنت متعدد بار منتقل کیا گیا ہے۔ ٹوکیو کو ملک کا دارالحکومت بنے ابھی دو صدیوں سے بھی کم عرصہ گزرا ہے۔ ٹوکیو سے پہلے گیارہ سو سال تک کیوٹو اور اس سے پہلے اوساکا کے نواح میں واقع نارا شہر ملک کا دارالحکومت رہا ہے۔ اسی سبب سے ٹوکیو اور نارا کو عالمی سطح پر ثقافتی اور تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ان دو شہروں کی متعدد عمارتوں کو تو اقوام متحدہ نے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے رکھا ہے۔ یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ جاپان میں دارالحکومت اس شہر کو کہا جاتا ہے جہاں بادشاہ اور اس کا خاندان رہائش پذیر ہو۔ جہاں بادشاہ کی رہائش ہوگی، عملی

طور پر وہی جاپان کا دارالسلطنت کہلائے گا۔ جیسے برطانیہ میں اگر آپ کسی سرکاری ملازم سے اس کا پیشہ دریافت کریں تو وہ خود کو ملکہ معظمہ کا خدمت گار بتاتا ہے۔ سرکاری اہلکار نہیں کہلاتا ہے۔
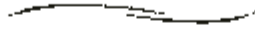
# ہیروشیما کا ایٹمی گنبد

دوسری جنگ عظیم میں امریکی ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہیروشیما اورنا گاساکی کے لوگوں نے جس آفت کا سامنا کیا، اس کے لئے المیے کا لفظ بہت چھوٹا لگتا ہے۔ چشم زدن میں لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ آگ کے شعلوں اور تابکار شعاعوں سے زندہ بچ جانے والوں میں لاکھوں انسان ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے۔ ایٹم بم کے نتیجے میں آنے والی ہولناک تباہی ایک دن کی بپتا نہیں تھی۔ برسوں بعد پیدا ہونے والے کئی بچے ایٹمی تابکاری اثرات کی وجہ سے معذور پیدا ہوتے رہے۔ اس مرگِ انبوہ کا مشاہدہ کرنے والے بہت سارے لوگوں نے وحشت کی وجہ سے دہائیوں تک ایک لفظ بھی منہ سے نہیں بولا۔ تہیم خاموش رہے۔ خوف، دہشت اور کرب کے اثرات زندہ بچ جانے والے لوگوں میں 70 سال بعد، آج بھی دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ جاپانیوں نے ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہنستے، بستے شہروں کو جل کر راکھ ہوتے دیکھا۔ ایسی تباہی کہ جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے دنیا میں کہیں نہیں ملتی، نہ ہی اس کے بعد کسی انسانی بستی نے ایسی

بربادی کا سامنا کیا۔

اس قوم نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی راکھ پر بیٹھ کر گریہ وماتم پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ نئے جذبے سے سرشار ہو کر تعمیر نو کی ایسی بھرپور مہم شروع کی کہ آج تک جاری محسوس ہوتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ جاپانیوں نے ماضی کو فراموش کر دیا۔ روایت پسندی اور جدیدیت کا ایسا خوبصورت امتزاج شاید ہی دنیا کے کسی اور معاشرے میں نظر آئے جیسا جاپان میں ہے۔

ماضی کے اسی سانحے سے جڑی ایک خبر نے ذہن میں عالمی جنگ کی تباہ کاریوں اور ایٹم بم کے اولین ہونے والے واقعے کو تازہ کر دیا۔ آپ نے ہیروشیما کے ایٹمی گنبد کی تصویر تو یقیناً دیکھی ہوگی۔ دنیا میں جہاں کہیں ایٹمی اثرات یا امن کی بات ہو تو وہاں ایٹم بم سے تباہ ہونے والی اس نیم کھنڈر نما عمارت کی تصویر ہی عموماً استعمال ہوتی ہے۔ ہیروشیما کے نام کے ساتھ اب امریکی ایٹمی بمباری سے متاثرہ یہ مٹیالے رنگ کا شکستہ گنبد فوراً دماغ میں آتا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے اس کثیر المنزلہ عمارت کو عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے رکھا ہے۔ اس کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پورے شہر میں یہ واحد عمارت ہے جو ایٹم بم گرائے جانے کے وقت موجود تھی، اور جس سے تباہی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس عمارت کو اب ایٹمی گنبد کہتے ہیں A۔ بم گنبد اس کے لئے عمومی طور پر مخفف استعمال ہوتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تہذیب یافتہ لوگ کینسر کے لئے "C" کا مخفف استعمال کرتے ہیں۔ ایٹم کو بھی یہ لوگ اب کینسر جیسا بد الفاظ ہی خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا صرف A کا مخفف صیغہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ عوام الناس بہر حال ضلعی صنعتی ترقیاتی مرکز کی اس سابقہ عمارت کو ایٹمی گنبد ہی کہتے ہیں۔

آج کے اخبار نے یہ اطلاع دی کہ مذکورہ عمارت کے ملبے کا ایک ٹکڑا، جو کہ

16 اگست 1945 کو ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے کی وجہ سے اس عمارت سے ٹوٹ کر قریبی دریا میں جا گرا تھا۔ اسے گزشتہ روز دریا سے باہر نکال لیا گیا ہے۔ 300 کلوگرام وزنی پتھر کا یہ ٹکڑا 2013 میں دریافت ہوا تھا۔ اس کو دریافت کرنے کا سہرا ہیروشیما یونیورسٹی کے ایک ادھیڑ عمر محقق کے سر سجتا ہے۔ گزشتہ دو برسوں کی تحقیق سے یہ عقدہ کھلا کہ ایٹم بم گرنے سے پہلے کی اٹی گنبد کی تصاویر کا جائزہ لیا جائے اور موجودہ تصاویر کو دیکھیں تو ثابت ہوتا ہے کہ 300 کلوگرام پتھر کا یہ ٹکڑا اس عمارت کی پانچویں منزل کی بالکونی سے ٹوٹ کر بکھرا اور قریبی عمارت میں آن گرا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایٹم بم کی تباہی سے تو پورا ہیروشیما شہر متاثر ہوا تھا، سب کی سب عمارتیں شکست وریخت کا شکار ہوگئیں، اگر جل کر وہ خاکستر نہیں بھی ہوئیں، پھر دیگر عمارتوں کو یادگار کے طور پر کیوں محفوظ نہیں کرلیا گیا؟ پورے شہر میں صرف ایک ہی عمارت محفوظ کیوں کی گئی؟ باقی شہر تو بالکل نیویارک، لندن، پیرس اور ٹوکیو جیسا جدید نگر ہے۔ اس پر مجھے پرانے زمانے کا ایک گاؤں یاد آتا ہے۔ اس گاؤں میں ایک بہت ہی پرانا کلیسا تھا۔ جب کبھی تیز ہوا چلتی تو گرجا گھر کی عمارت جھولنے لگتی۔ یوں لگتا کہ آج گرا یا کل گرے گا۔ گاؤں کے لوگ اس بابت آتے جاتے بات چیت کرتے کہ کیا کیا جائے؟ تعمیر نو کی بات بھی ہوتی۔ کبھی مرمت اور تزئین و آرائش کا ذکر آ جاتا، اب مگر یہ کلیسا مرمت اور رنگ وروغن سے سنورنے کے مقام سے آگے گزر چکا تھا۔ عرصے سے اس میں عبادت کا اہتمام ترک کردیا گیا تھا۔ اجتماع کا تو سوال ہی نہیں، اکیلے بھی اس میں داخل ہوتے ہوئے کمزور ایمان کے لوگ گھبراتے تھے کہ ملبہ ان پر ہی نہ آن گرے۔ سچ تو یہ ہے کہ گاؤں والے اس کے قریب سے بھی گزرنے سے کتراتے تھے۔ ایک دن اس پرانے کلیسا کی گویا سنی گئی۔ تمام گاؤں والوں کی اس موضوع پر پنچایت اکٹھی ہوئی۔ سب لوگوں

نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ متفقہ طور پر نیا کلیسا تعمیر کرنے کا عزم کیا گیا۔ مگر پرانے گرجا گھر کی عمارت سے بھی لوگوں کو بے حد انس تھا، اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ نئی عمارت اسی نقشے کے تحت اور اسی مقام پر تعمیر کی جائے گی۔ مزید یہ بات بھی متفقہ طور پر منظور کر لی گئی کہ جب تک نئی عمارت مکمل نہ ہو جائے، پرانی عمارت نہیں گرائی جائے گی۔ فیصلے کے بعد تمام گاؤں والے مطمئین ضمیر کے ساتھ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور یہ کلیسا کبھی بھی نہ بن سکا۔ سنا ہے پرانے کلیسا کی عمارت اب بھی ہوا سے جھولتی ہے۔ نئی تعمیر کے لئے پرانے سنگ وخشت تو ہٹانا ہی پڑتے ہیں۔ ہیروشیما کی جنگ زدہ تمام عمارات کے منہدم ہو جانے کی وجہ سے، ایٹم بم کے اثرات کی یادگار کے طور پر بچ جانے والی واحد عمارت ہونے کے سبب ایٹمی گنبد کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ ابھی یہ طے نہیں کیا گیا کہ اس عمارت کے ملبے کا ملنے والا ٹکڑا کس کام آئے گا۔ مگر دوسری جنگِ عظیم میں ایٹم بم سے ہونے والی تباہی اور امن کی ضرورت تو یہ ٹکڑا ہر حال اجاگر کرتا رہے گا۔

لاطینی امریکہ کے اساطیری انقلابی گوریلا چے گویرا نے ہیروشیما سے اپنی بیٹی کو جو پوسٹ کارڈ بھیجا تھا اس پر لکھا تھا کہ امن سے محبت کرنے والے ہر شخص کو زندگی میں ایک بار یہ ایٹمی گنبد ضرور دیکھنا چاہیئے۔ ارجنٹائن میں پیدا ہو کر کیوبا کا انقلاب برپا کرنے کے علاوہ کئی ملکوں میں اشتراکی حکومت کے قیام کے لئے مسلح جدوجہد کا سرخیل چے گویرا اتنا بڑا موضوع ہے کہ پوری کتاب کا متقاضی ہے۔ امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے ساتھ لڑتے ہوئے بولیویا میں مارا جانے والا بہادر کمانڈر چے گویرا شاعروں کا ہیرو تھا۔ اس پر پھر کبھی تفصیل سے بات کریں گے۔

# ایٹمی بمباری کی یاد

اگست کا مہینہ جاپان میں مرنے والوں کو یاد کرنے کا مہینہ ہے۔ جس طرح محرم الحرام میں روایتی طور پر ہم لوگ عموماً اپنے پیاروں کی قبروں کی صفائی ستھرائی اور لیپا پوتی کے لیے جاتے ہیں، یہاں ماہ اگست میں جو شخص جس علاقے سے بنیادی تعلق رکھتا ہو۔ واپس اپنے عزیزوں کی قبروں پر حاضری اور دیکھ بھال کے لئے جاتا ہے۔ جاپانی قبرستانوں کو آپ کنکریٹ کا قبرستان کہہ سکتے ہیں۔ کنکریٹ کے فرش پر قد آدم اونچائی اور ایک مربع میٹر رقبے میں قبر کا پتھر سے تراشیدہ تعویذ ہوتا ہے۔ قبر کو سادھی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ مردے کو جلانے کے بعد اس کی استھیاں اور باقیات ایک چھوٹے مٹکے میں بند کر کے اس میں رکھی جاتی ہیں۔ ہر خاندان کی ایک ہی سادھی ہوتی ہے، جس میں ہر مرنے والے کا مٹکا رکھا جاتا ہے۔ سکول کے بچوں کو پورا مہینہ چھٹیاں ہوتی ہیں۔ دفاتر میں کیلنڈر کی تو کوئی چھٹی نہیں ہوتی لیکن ہر ادارہ اپنی سہولت کے مطابق چار، چھ دن یا پھر ہفتہ بھر کی چھٹیاں مناتا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو اپنے آبائی علاقوں میں جانے کا موقع فراہم کرنا ہوتا

ہے۔روایتی لباس میں ملبوس علم وطبل بردار نوجوان جلوس نکالتے ہیں،ہر بستی بستی ،نگر نگر نکلنے والے ان جلوسوں کا رنگ تعزیے کی بجائے عرس کا ہوتا ہے۔اس تفاوت کی وجہ موت اور حیات کا مذہبی تصور ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے اس رواج کی بابت حالات میرے علم میں نہیں ہیں۔مگر جنگ عظیم دوم کے آخری دنوں میں،سن 1945 میں اسی اگست کی چھ تاریخ تھی،جب ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا گیا۔ستر ہزار لوگ چند سیکنڈ میں اور ایک لاکھ چالیس ہزار انسان چند دن میں اس ایٹم بم سے ہلاک ہو گئے۔تین لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں ایٹمی تابکاری کے اثرات سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔کئی دہائیوں بعد بھی پیدا ہونے والے کئی بچے اسی وجہ سے معذور پیدا ہوتے رہے۔سارا شہر جل کر زمین بوس ہو گیا۔اس مرگِ انبوہ کی نشانی کے طور پر ایک ادھ جلی عمارت کو محفوظ کر کے وہاں امن میوزیم بنا دیا گیا ہے۔اسے ایٹمی گنبد کہتے ہیں۔

تین دن کے وقفے کے بعد امریکی صدر ہیری ٹرومین کے حکم پر صنعتی شہر ناگاساکی میں دوسرا ایٹم بم پھینکا گیا۔چشم زدن میں ایک لاکھ شہری جان کی بازی ہار گئے۔دونوں شہروں میں مرنے والوں کا اندازہ تو شائد کبھی بھی نہ لگایا جا سکے،مگر بلا مبالغہ یہ تعداد لاکھوں میں تھی۔ان شہروں کو ایٹمی اسلحے سے نشانہ بنانے ،جسے اس وقت اسٹیبلشمنٹ نے ''سوپر ویپن'' کا نام دیا تھا،ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ دو شہر ایسے تھے جن میں کوئی بھی امریکی فوجی جنگی قیدی نہیں تھا۔چھ اگست کو ہیروشیما پر گرائے گئے ایٹم بم کا نام ''لٹل بوائے'' رکھا گیا تھا۔جس نے مشروم کی شکل کا ایٹمی بادل پیدا کر کے دنیا میں ایٹمی اسلحے کے حصول کی دوڑ کا اعلان کر دیا۔ناگاساکی پر نو اگست کو پھینکے گئے ایٹم بم کو ''فیٹ مین''یعنی موٹے آدمی کا نام دیا گیا تھا۔ان ناموں سے امریکیوں کی حسِ مزاح اور بزلہ سنجی کے علاوہ

بے حسی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

پندرہ اگست 1945 کو جاپانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے، عسکری ماہرین کا خیال ہے کہ امریکہ اگر ایٹم بم کا استعمال نہ بھی کرتا تب بھی جاپان ہتھیار ڈال دیتا، چونکہ یورپ میں اس کا اتحادی جرمنی مئی کے مہینے میں شکست کھا چکا تھا، اور وہاں جنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ ایٹمی بمباری سے شائد 1941 میں امریکی بندرگاہ پرل ہاربر پر جاپانی حملے کا بدلہ لینا مقصود تھا۔ یہ حملہ امریکہ کی جنگ عظیم دوم میں شمولیت کی وجہ بنا۔ اس سے پہلے جنگ میں شمولیت کے بارے میں امریکی عوام اور اسٹیبلشمنٹ کی رائے منقسم تھی۔ امریکی صدر ٹرومین پر تنقید کی جاتی ہے کہ گنجان آباد شہروں پر ایٹم بم گرانا اس کی غلطی تھی۔ جاپان جزائر پر مشتمل ہے۔ اس کی ناکہ بندی ہو سکتی تھی۔ اگر ایٹمی ہتھیار کا استعمال ناگزیر تھا تو پھر کسی ویران یا کم آبادی والے علاقے میں استعمال کر لیتے۔ تجزیہ کار کہتے ہیں کہ امریکی ایٹمی بمباری کا ایک مقصد سویت یونین کو متنبہ کرنا بھی تھا۔ کہ امریکہ عسکری طور پر کتنا آگے جا چکا ہے۔ اسٹالن کی حوصلہ شکنی بھی مقصود تھی۔ مگر دو ارب ڈالر خرچ کر کے بنائے گئے ان ایٹمی ہتھیاروں کی بمباری سے سویت یونین اور جوزف اسٹالن کا حوصلہ تو نہ ٹوٹ سکا البتہ کرہ ارض پر ریاستوں کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی ایک نہ ختم ہونے والی خطرناک دوڑ ضرور شروع ہو گئی۔

چھ اگست 1945 کی صبح آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر ہیروشیما پر گرنے والے ایٹم بم نے دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنگ کا تصور ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ستر سال بعد اسی دن، اسی وقت پر اسی جگہ جاپانی وزیر اعظم نے یادگاری تقریب سے خطاب کیا۔ ایٹم بم گرنے کی جگہ پر امن پارک قائم ہے۔ جہاں اس تقریب میں وزیر اعظم کے علاوہ دنیا بھر سے آئے سفارت کاروں اور عام شہریوں نے شرکت کی۔ اس مرگ انبوہ کے عینی شاہدین بھی تقریب میں شریک ہوئے۔ شرکاء

میں جاپان میں امریکی سفیر اور سابق امریکی صدر جان ایف کینیڈی کی بیٹی کیرولین کینیڈی بھی شامل تھی۔ ہلاک شدگان کی یادگار پر پھول چڑھائے گئے اور ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ یہی عمل تین دن بعد نو تاریخ کو ناگاساکی میں دہرایا گیا۔ نو اگست کی تقریب میں وزیراعظم اور دیگر مقررین کے خطاب کا موضوع دنیا میں امن کا حصول اور ایٹمی اسلحے کا خاتمہ تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں کس حکمران کا کتنا قصور تھا؟ اور کون سی ریاست کتنی قصوروار تھی؟ اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ شائد ناممکن ہی ہو گا۔ کیونکہ جنگ میں تو پہلی موت ہی سچائی کی ہوتی ہے۔ اس وقت کا جاپان مشرق بعید میں جارحیت کا مرتکب تھا۔ نوآبادیاں قائم کر رہا تھا، دیگر بھی ایسے بہت سے امور میں ملوث تھا جن کی توجیح پیش نہیں کی جا سکتی۔ امریکہ کی جانب سے مگر لاکھوں معصوم لوگوں کو ایٹمی شعلوں میں جلا کر بھسم کر دینا ایک ایسا عمل ہے جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ مورخ اسے ظلم کے علاوہ کسی دیگر نام سے یاد نہیں کرے گا۔ میری دعا ہے کہ کسی بستی کے لوگوں کو کبھی ایسا سانحہ نہ دیکھنا پڑے جیسا گزشتہ صدی میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے لوگوں نے دیکھا۔
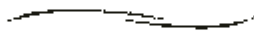
# مستقبل کا سفر

دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ میں آج کل جاپان کی نئی تیز ترین بلٹ ٹرین کی ریکارڈ ساز رفتار کا چرچا ہے۔ پہلی بار سننے میں 603 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار زمین پر چلنے والی کسی گاڑی کی بجائے ہوائی جہاز کی رفتار معلوم ہوتی ہے۔ گزشتہ دنوں مگر سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں نے شین کان سین نامی ٹرین کے اس ماڈل، جسے ''میگلیف'' کا نام دیا گیا ہے، پر سوار ہو کر 603 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار پر سفر سے لطف اندوز ہونے کا منفرد اعزاز حاصل کیا۔ فی الحال تو میگلیف کا مخصوص ٹریک جس پر یہ چلتی ہے 42 کلومیٹر طویل آزمائشی طور پر ٹوکیو کے گردونواح میں بچھایا گیا ہے، مگر دس سال بعد بڑے بڑے شہر اس ٹریک کے ذریعے آپس میں منسلک ہو چکے ہوں گے۔ آمدورفت کے شعبے میں اس ٹرین کی ایجاد کو ایک انقلاب سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں نے اس ٹرین پر سفر کیا، ان کا عمومی تاثر یہ ہے کہ یہ جہاز اور ریل گاڑی کا ملغوبہ ہے۔ دوران سفر آنے والے معمولی ہچکولے بھر تھراہٹ اور آواز ٹرین سے زیادہ فضائی طیارے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جس وقت ریل گاڑیوں کی تاریخ میں 603

کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کا نیا ریکارڈ بنا تو سات بوگیوں پر مشتمل اس بلٹ ٹرین پر ریلوے ملازمین اور چند میڈیا کے افراد سوار تھے۔

کیسا حسین خیال ہے جب یہ ٹریک پاکستان میں بچھ جائے گا تو لاہور اور کراچی کے درمیان دو گھنٹے کی مسافت رہ جائے گی۔ خیر پاکستان کی سرزمین پر اس بلٹ ٹرین چلنے کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے شاید طویل وقت درکار ہوگا مگر امریکہ کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ امریکہ بھی جاپان سے یہ بلٹ ٹرین ٹیکنالوجی خرید کر اپنے ہاں لے جانا چاہتا ہے۔ ابتدائی طور پر نیویارک سے لے کر دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے درمیان ریلوے لائن بچھائے جانے کا منصوبہ زیر گفتگو ہے۔ امریکہ کے ان دو بڑے اہم شہروں کے درمیان بلٹ ٹرین کا ٹریک بچھانے کے خرچ کا تخمینہ سو ارب امریکی ڈالر لگایا گیا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مذکورہ ٹریک اتنا مہنگا کیوں ہے؟ وجہ اس کے مہنگا ہونے کی یہ ہے کہ کہنے کو تو یہ ریل کی پٹڑی ہی ہے مگر روایتی ریلوے ٹریک سے بالکل مختلف چیز ہے۔ پہلی بات تو بلٹ ٹرین کے معاملے میں یہ ہے کہ اس کی پٹڑی سطح زمین سے کم از کم تیس فٹ بلندی پر تعمیر کی جاتی ہے، دور سے دیکھنے پر تو یہ کنکریٹ کا طویل پل دکھائی دیتی ہے، مقصد اس کا سطح زمین پر پیش آنے والے حادثات سے بچاؤ اور گردوپیش کی رکاوٹوں کے تدارک کے علاوہ یہ بھی ہے کہ زمین ہر جگہ یکساں خصوصیات نہیں رکھتی، جبکہ بلٹ ٹرین کو یکساں پٹڑی درکار ہے، عام رفتار پر تو یہ چیز اہم نہیں مگر سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار پر یہ بات نہایت اہم ہے کہ ٹریک کی بنیادیں کیسی ہیں؟

دوسری بات شین کان سین کے معاملے میں یہ ہے کہ اس کی پٹڑی عام ریل گاڑی کی پٹڑی کی طرح دورویہ، فولاد سے بنی ہوئی نہیں ہوتی ہے۔ یہ ٹریک یک رویہ تقریباً دو فٹ چوڑا اور چھ انچ اونچا ہوتا ہے۔ فقط فولاد اس کے بنانے میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ

لوہے کے علاوہ، مقناطیس اور کئی ہم جنس دھاتوں کا مرکب اس پٹڑی کو ڈھالنے میں استعمال ہوتا ہے، بلند رفتار پر یہ دھاتیں ٹرین اور ٹریک کے درمیان کشش پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔گاڑی پٹڑی سے نہیں اترتی ہے۔

ویسے امریکیوں کے ذرائع آمد ورفت پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ انہیں ریل گاڑی میں سفر کرنا کوئی زیادہ پسند نہیں ہے۔آپ دیکھیں کہ امریکہ کی آبادی تو جاپان سے تقریباً دوگنا ہے مگر سالانہ ریل گاڑی پر سفر کرنے والے مسافروں کی تعداد پر غور کیا جائے تو اعداد وشار بتاتے ہیں کہ جاپانیوں کے مقابلے میں فقط دس فیصد تعداد میں امریکی ریل پر سفر کرتے ہیں۔اس کی وجہ شاید گاڑیوں کی رفتار اور معیار بھی ہے۔امریکہ میں تو گزشتہ ہفتے بھی ریل گاڑی پٹڑی سے اترنے کے سبب دس لوگ ہلاک ہوگئے۔جبکہ بلٹ ٹرین 1964ء سے میدان عمل میں ہے اور نصف صدی میں ایک بھی حادثہ نہیں ہوا۔

رواں ہفتے ہنڈا موٹر کمپنی کے تیار کردہ، سات سواریوں کے لیے مخصوص، چھوٹے مسافر جیٹ طیارے نے بھی پہلی مرتبہ جاپان کی فضاؤں میں پرواز کیا۔ہنڈا جیٹ کا ٹوکیو ایئرپورٹ سے شروع ہونیوالا یہ سفر چار اہم شہروں کے ہوائی اڈوں پر مختصر قیام کے بعد ٹوکیو واپسی پر ہی مکمل ہوا۔ہر شہر کے ہوائی اڈے پر کمپنی کے ملازمین نے اپنے ہی تیار کردہ جہاز کا استقبال کیا۔یاد رہے کہ امریکہ میں گزشتہ برس ہنڈا جیٹ طیارہ اپنی آزمائشی پروازوں کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر چکا ہے۔نئے ہوائی جہاز کی قیمت ذاتی طور پر میرے لیے بڑی دلچسپی کا حامل سوال رہا ہے۔صاحبان! اس جہاز کی قیمت پاکستانی روپوں میں 45 کروڑ، یعنی 4.5 ملین ڈالر۔مزید ار بات یہ ہے کہ اس جہاز کی ڈلیوری بھی اسی سال گاہکوں کو شروع ہوجائے گی۔پہلے مرحلے میں 100 گاہک اپنے جیٹ طیارے رواں برس حاصل کریں گے۔ہنڈا موٹر کمپنی کی موٹر سائیکل CD70 کی طرح اس

طیارے کی نمایاں خوبی بھی یہی بتائی جا رہی ہے کہ اس میں تیل کا خرچہ بہت ہی کم ہے۔ اپنے ہم پلہ مسابقتی اداروں کے تیار کردہ مسافر جیٹ طیاروں کی نسبت پٹرول کے کم خرچ کے علاوہ ہنڈا جیٹ میں کیبن زیادہ کشادہ بیان کیا جاتا ہے۔

جاپان کی ہنڈا کمپنی کے بانی مالک مسٹر ہنڈا نے 1962ء میں طیارہ سازی کے کاروبار میں داخل ہونے کا اعلان کیا تھا۔ 1965ء میں ہنڈا ایئر کرافٹ کمپنی قائم کر کے باقاعدہ کام کا آغاز کیا گیا۔ مسٹر ہنڈا کے ہوائی جہاز بنانے کے اس خواب کو حقیقت کا روپ دھارنے میں نصف صدی کا عرصہ لگا۔ اس تذکرے کا مقصد ہنڈا جیٹ طیارے کے محاسن سے زیادہ جاپانی قوم کی مستقل مزاجی اور ایفائے عہدی کی عادات بیان کرنا ہے۔ دورانیہ چاہے جتنا بھی طویل ہو، کام جیسا بھی مشکل ہو، یہ ہمت نہیں ہارتے، آہستہ آہستہ مگر مستقل طور پر کام میں جٹے ہی رہتے ہیں۔ جلدی گھبراتے اور اکتاتے نہیں ہیں۔
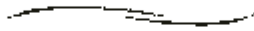
# چیری بلاسم اور کاتیرینا کے سوالات

چیری بلاسم کو جاپان کا سب سے اہم سماجی تہوار کہیں تو یہ مبالغہ آرائی نہیں حق بیانی ہے۔ بہار کی آمد سے زیادہ یہاں چیری کے پھولوں کا انتظار ہوتا ہے۔ اس تہوار کے لیے جاپانی زبان میں بڑا خوبصورت لفظ رائج ہے، ''ہنامی'' لفظی ترجمہ جس کا پھول دیکھنا ہے، رونمائی گل بھی کہہ سکتے ہیں۔ عملی طور پر اس سے مراد موسم بہار کے وہ دو، چار دن ہیں جن میں چیری کے پھول کھلتے ہیں۔ مقامی کیلنڈر پر تو آپ کو یہ تہوار نظر نہیں آئے گا، کیونکہ ہر ضلع میں چیری کے درخت کی شاخیں مختلف تاریخوں میں پھول اٹھاتی ہیں۔ اور پھر ان دنوں میں کوئی سرکاری تعطیل بھی نہیں ہوتی۔ خوش قسمتی سے اگر ہفتہ، اتوار، پھول رُت کے جوبن کا دن ہوتو میلے کا مزہ دوآتشہ ہو جاتا ہے۔

اس تہوار کی مثال ماضی کے لاہور میں بسنت کے پتنگ میلے جیسی ہے۔ لاہور میں جیسے بسنت کا تہوار کبھی سال کا سب سے رنگا رنگ تہوار ہوتا تھا، حالانکہ کیلنڈر پر تو بسنت کا وجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ بسنت کے موضوع پر تو پھر کبھی لکھوں گا، کہ اس خوشیوں

بھرے خوبصورت تہوار اور صدیوں سے قائم بہار کی روایت کے خاتمے کا دکھ بہت ہے ،مگر کیمیکل ڈور سے معصوم بچوں کے گلے کٹتے بھی نہیں دیکھے جاتے ۔ ہر سال جاپان میں چیری کے پھولوں کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے سیاح کھنچے چلے آتے ہیں ۔ اگر کسی نے سیر کے لیے جاپان آنا ہو تو اسے سفر کے لیے میں یہی مشورہ دوں گا کہ فصل گل کا انتخاب کرے ۔ اس سال بارش کی شدت نے کونپلوں کو برباد کرنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی ،مگر پھر بھی جب جب سورج بادلوں کی قید سے چھوٹ کر اپنا رخ دکھاتا ہے تو باغوں پر جنت کا گمان ہونے لگتا ہے ۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ مناظر حقیقی نہیں بلکہ کوئی آئل پینٹنگ ہے ۔ ایسا حسن کہ آنکھوں پر یقین کرنا مشکل ہے ۔ چیری کے درخت جابجا یہاں ندی ،نالوں کے کناروں اور دریاؤں کے آس پاس نظر آتے ہیں ۔ علاوہ ازیں ،ان کے لیے یہاں مخصوص باغات بھی ہیں ۔ ہر شہر میں کم از کم ایک ایسا باغ تو ضرور ہوتا ہے ۔

ایسے ہی ایک بوٹینکل گارڈن میں خراماں چلتا ہوا میں چیری کے پھولوں کی تازگی اور رضا کار موسیقاروں کے لائیو میوزک سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ کسی نے میرا نام پکارا ۔ میں نے پلٹ کر اس نسوانی آواز کی سمت دیکھا تو میری ایک روسی نژاد ہم جماعت اپنے خاوند اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ منڈلی جمائے بیٹھی نظر آئی ۔ ہاتھ ہلا کر جو مجھے بلا رہی تھی ۔ اس موسم میں تو جہاں بھی چیری کے چار درخت ہوں وہاں لوگ چٹائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں ،کھاتے ،پکاتے ،پیتے ،پلاتے ہیں ،صبح سے لیکر شام تک کا منظر یہی ہے کہ لوگ ٹولیوں کی شکل میں آتے ہیں ،کھانے پینے کے لوازمات ہمراہ لاتے ہیں اور پھولوں سے لدے درختوں کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں ۔ باغات میں تو میلے کا سماں ہوتا ہے ۔ ماشا کئی سال قبل سکول میں میرے ساتھ جاپانی زبان سیکھا کرتی تھی ۔ اس کے جاپانی شوہر نے مجھے جوتے اتار کر چٹائی پر اس کے اہل خانہ کے ساتھ دعوت میں شریک ہونے پر اصرار کیا ۔

یہاں بتاتا چلوں کہ روسی معاشرے میں بھی ہماری طرح عرفیت کا رواج ہے۔ وہاں ہر ماریا نام کی لڑکی ماشا، الیگزینڈر تمام ساشا، دمتری نام کے تمام لڑکے دیما کہلاتے ہیں۔ شرکائے محفل میں باقی تمام تو جاپانی چہرے تھے صرف ایک بزرگ روسی خاتون تھی۔ تعارف ہونے پر پتا چلا کہ وہ ماشا کی والدہ کاتیرینا گورینا عرف کاتا ہے۔ کاتا خصوصی طور پر چیری کے پھول دیکھنے کے لیے سائبیریا سے گزشتہ ہفتے جاپان پہنچی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ روس سے باہر نکلی تھی، اسی لیے ہر چیز کو سیاحوں جیسے تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بڑھیا کو روسی کے علاوہ کسی دوسری زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا۔ جب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ میں روسی زبان جانتا ہوں تو اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

کاتیرینا کے سوالات انتہائی سادہ مگر بہت ہی دلچسپ تھے۔ سب سے پہلے پوچھنے لگی کہ پاکستان میں سب سے غریب لوگ کیا چیز کھاتے ہیں؟ جیسے ہمارے روس میں تو غریب ترین لوگ آلو کھاتے ہیں، آپکے غرباء کی خوراک کیا ہے؟ میرا جواب روکھی سوکھی روٹی اور سادہ چاول تھا۔ اس پر بڑھیا نے تنک کر کہا ''پھر تو وہ اتنے غریب نہیں ہونگے'' اگلا سوال یہ تھا کہ حرم کیا ہوتا ہے؟ میں نے گھر، آشرم، آستانہ اور بڑی رہائش گاہ کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔ بڑھیا نے مجھے شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ زیادہ بھولے بننے کی کوشش مت کرو، میں اس حرم کی بات کر رہی ہوں جس میں تم مسلمان مرد بہت ساری عورتیں جمع کرتے ہو۔ تمہیں چار شادیاں کرنی ہوتی ہیں یا پھر اس سے زیادہ اور کم بھی کر سکتے ہو؟

جس حرم کا وہ تذکرہ کر رہی تھی اس کے جواب میں اسے بتایا کہ کثرت ازدواج کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ طاقت اور دولت سے ہے۔ اس کی ہم نام روسی ملکہ کاتیرینا عالیہ کی مثال دیکر پوچھا کہ بتاؤ بھلا اس کے سترہ شوہروں کا کیا جواز تھا؟ وہ کوئی مسلمان تو نہیں

تھی؟ اس پر کاتا کہنے لگی کہ ملکہ کاتیرینا عالیہ بڑی حکمران تھی، اس کُتیا نے آلاسکا امریکہ کو فروخت کر دیا تھا۔ اس تبصرے میں مزید ننگی گالیاں شامل تھیں، جو کہ یقیناً ناقابل اشاعت ہیں۔ پھر پوچھنے لگی سب سے پہلے اسلام کس نے قبول کیا تھا؟

اس کے اس استفسار نے مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا کہ دنیا میں سب سے پہلے اسلام کس نے قبول کیا تھا؟ جواب تو سادہ سا تھا کہ حضرت خدیجہؓ۔ اسکے سوال نے سوچ کا ایک نیا دریچہ کھول دیا۔ ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰؐ پر ایمان لانے والی تاریخ کی پہلی شخصیت ایک خاتون تھیں۔ کاتیرینا سے میں نے کہا کہ تم لوگ مسلمانوں پر الزام لگاتے ہو کہ ہم عورتوں کو برابری کے حقوق نہیں دیتے ہیں، دیکھا تم نے کہ ہماری امت کی تو پہلی فرد ہی عورت ہے۔

کہنے لگی ہاں !! مشکل وقت میں عورتیں ہی ساتھ دیتی ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو جب مصلوب کیا گیا تو ان کی لاش وصول کرنے کے لیے ایک بھی مرد موجود نہیں تھا۔ تینوں عورتیں تھیں۔ ایک مریم مقدسہؑ دوسری ماریا مگدالینا اور تیسری عورت اسی مگدالینا کی بہن تھی۔ یسوع مسیحؑ کے تمام مرد اصحاب خوف، سستی، مصلحت یا پھر کوئی اور وجہ سے سامنے آنے سے قاصر رہ گئے تھے۔ تین عورتیں ہی جسد خاکی لیکر کلوری (Calvary) کی پہاڑی سے اتری تھیں۔
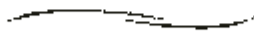
# ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

ابن انشاء نے جھوٹ کی تین اقسام بیان کی ہیں۔ جن میں پہلی قسم جھوٹ، دوسری سفید جھوٹ اور تیسری قسم سرکاری اعداد وشمار قرار دی ہے۔ جاپان کے عوام کا تو ذکر ہی کیا، کہ بڑے نیک طینت لوگ ہیں۔ لگتا ہے کہ حکومت کا بھی چلن ہم سے الگ تھلگ ہے، اور ابن انشاء کے محولہ بالا زریں قول پر یہ سرکار پورا اترنے میں ناکام رہی ہے۔ قصہ کوتاہ یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے سالانہ ملکی شرح نمو میں جو دو، اڑھائی فیصد اضافے کی توقع اور پیش گوئی کی جارہی تھی، حقیقت میں ایسا نہ ہوسکا، معاشی شعبے سے متعلقہ سرکاری محکمے کی سہ ماہی رپورٹ کے مطابق کل ملکی پیداوار میں اضافے کی بجائے، 7.6 فیصد منفی، یعنی کمی کا رجحان ریکارڈ کیا گیا ہے۔ گزشتہ دنوں حکومت کے کابینہ کے معاشی کارکردگی کے دفتر نے جونہی ان اعداد وشمار کا اعلان کیا، بلاکسی تاخیر کے وزیر اعظم نے اعلان کردیا کہ موجودہ معاشی رجحان کو دیکھتے ہوئے کچھ اہم تبدیلیاں کرنا ناگزیر ہے۔ مجوزہ معاشی تبدیلیوں کے سلسلے میں عوام کا دوبارہ اعتماد حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہوں، لہذا قبل از وقت انتخابات

بہترین راستہ ہے۔اس کے ساتھ ہی وزیراعظم نے قومی اسمبلی تحلیل کرنے اور چودہ دسمبر کو نئے انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا۔

جہاں تک سرکاری اعداد وشمار اور بیانیے پر عوام کے اعتبار اور اعتماد کرنے کا سوال ہے، اس بارے میں صرف ایک مثال ہی ملاحظہ فرمائیں، بات کافی حد تک صاف ہو جائے گی، یہاں کا سب سے مقبول نشریاتی ادارہ سرکاری ٹیلی وژن NHK ہے۔سرکاری نیوز چینل سے اگر مقابلے کی بات کی جائے تو بے شمار نجی چینلز میں سے کسی کی بھی ریٹنگ NHK سے آدھی بھی نہیں ہے۔یہی حال ریڈیو کا ہے۔سرکاری ریڈیو سب سے زیادہ سنا جا تا ہے۔کسی خبر کے مصدقہ ہونے کے لیے یہاں لوگ یہ سند پیش کرتے ہیں کہ وہ سرکاری ٹی وی یا پھر سرکاری ریڈیو پر نشر ہوئی ہے۔میڈیا میں خود احتسابی کا عمل بہت کڑا ہے۔بڑے بڑے جرائم کا تو ذکر ہی کیا، اگر کسی اینکر پرسن یا ٹیلی وژن میزبان کا ٹریفک چالان کسی سنگین خلاف ورزی کی بناء پر ہو جائے تو بعض اوقات وہ خود، اور اکثر صورتوں میں نشریاتی ادارے، اس کے سکرین پر ظاہر ہونے پر پابندی عائد کر دیتے ہیں۔میڈیا شخصیات کی ایک طویل فہرست ہے جو اخلاقی جرائم میں ملوث ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے منظر سے غا ئب ہو گئیں۔ایک اور مثال سے بات کی وضاحت ہو جائے گی۔ جاپان کا سب سے کثیر الا شاعتی اخبار ''آساہی'' ہے، اردو میں اسے صبح صادق کہہ لیجیے، اخبار کے سب سے کثیر الاشا عت ہونے کی نسبت سے اگر آپ اس کے ایڈیٹر کو نشریاتی شعبے کی سب سے معتبر شخصیت کہہ لیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ ابھی تک یہاں بھی پرنٹ میڈیا زیادہ سنجیدہ صحافت کا امین سمجھا جاتا ہے اور اخبار ہی کلیدی ذریعہ اطلاعات ہے۔مذکورہ اخبار کے مدیر اگلے ماہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں گے۔صحافتی شعبہ کے اس نابغہ روزگار کا کیریئر ہمیشہ کے لیے ختم ہونے جا رہا ہے۔اس کی وجہ متذکرہ اخبار میں صرف ایک عدد خبر اور ایسے مضمون کی اشاعت

ہے جو کہ حقائق پر مبنی نہیں تھا۔

جاپان میں بھی پاکستانی طرز جمہوریت رائج ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ برطانوی ویسٹ منسٹر پارلیمانی طرز جمہوریت ہے، انگلستان کی طرح یہاں بھی ریاست کا سربراہ بادشاہ ہے۔ اگلے روز قومی اسمبلی کے سپیکر نے ایوان زیریں تحلیل کرتے ہوئے شاہی فرمان پڑھ کر سنایا۔ جس میں وزیر اعظم کی جانب سے شہنشاہ معظم کے نام نامی سے اسمبلی تحلیل کیے جانے کا مختصر اعلان تھا۔ گزشتہ دو، تین دنوں سے جو تجزیے۔ ذرائع ابلاغ کی وساطت سے سنے اور پڑھے ہیں، ان کے مطابق تو موجودہ حکمران جماعت ہی دوبارہ انتخابات جیت جائے گی اور پھر اقتدار سنبھال لے گی۔ جن عام ووٹروں سے اس موضوع پر بات ہوئی، ان سب کی رائے بھی یکساں تھی کہ سو فیصد یہی وزیر اعظم دوبارہ منتخب ہو جائے گا، اور نئی حکومت تشکیل دے گی۔

یوں تو انگریزوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سیاست کے موضوع پر صرف نشے کی حالت میں ہی گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں بقائمی ہوش وحواس سیاسی موضوعات سے اجتناب برتتے ہیں۔ جاپانی نشے کے عالم میں بھی سیاست پر گفتگو سے پرہیز کرتے ہیں۔ بارہا ہمارے غیر ملکی دوستوں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ کسی جاپانی شخص سے وزیر اعظم کا نام بھی دریافت کیا گیا تو اس نے نفی میں جواب دیا، کہ میں نہیں جانتا کہ ملک کا وزیر اعظم کون ہے!! دراصل آج کل کام کی مصروفیت اتنی زیادہ ہے کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ حکمران کون ہے!! معلوم نہیں کہ یہ سیاست سے عمومی بے رغبتی ہے، یا پھر اس رویے کا سبب یہ ہے، کہ کوئی بھی حکومت آئے یا چلی جائے، عام آدمی کی زندگی اور معمولات زیست پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے، لوگ شاید ڈرتے ہیں کہ مخالف سیاسی رائے دینے سے کسی کی کہیں دل آزاری نہ ہو جائے۔ لوگوں کا عمومی رویہ چونکہ یہی ہے کہ اختلاف

رائے نہیں کرتے۔ہاں میں ہاں ملاتے چلے جاتے ہیں۔کبھی خاموشی سے تائید کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا کہ اس سیاسی دھماچوکڑی کی وجوہات خالصتاً معاشی نوعیت کی ہیں۔وزیر اعظم شنزو آبے کی معاشی اصطلاحات اور پالیسیوں کو عرف عام میں بروزن اکنامکس، ''آبے نامکس'' کہا جاتا ہے۔اس برس حکومت نے عام اشیاء کی خریداری پر سیلز ٹیکس کی شرح پانچ فیصد سے بڑھا کر آٹھ فیصد کر دی تھی۔اگلے مرحلے میں، اسے اگلے برس کے آخر تک دس فیصد تک پہنچانا تھا۔مگر سیلز ٹیکس کی شرح بڑھانے کے بعد والی سہ ماہی معاشی رپورٹ نے بتا دیا کہ ملک اور عوام اسے مزید بڑھائے جانے کے لیے فی الحال تیار نہیں۔لہذا حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ سیلز ٹیکس کی شرح میں مجوزہ اضافہ ڈیڑھ، دو برس کے لیے مؤخر کر دیا جائے۔وزیر اعظم نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا کہ سیلز ٹیکس کی شرح آٹھ سے بڑھا کر دس فیصد کرنے سے، یا پھر نہ کرنے سے، عام آدمی کی زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر ہوگا، اس لیے لازم ہے کہ ایک بار پھر عوام سے رائے لی جائے۔اپنے فیس بک پیغام میں وزیر اعظم کا مزید کہنا تھا کہ میں جب بھی کبھی ٹیکس کے نظام میں کوئی تبدیلی کرتا ہوں، ایسے موقع پر ضروری سمجھتا ہوں کہ رائے دہندگان سے ان کی رائے معلوم کروں اور ان کا اعتماد حاصل کروں۔جمہوریت اور جمہوری روایات جب کسی ملک میں مضبوط ہو جائیں تو پھر ایسے ہی ہوتا ہے۔معاشی اعدادوشمار کی اونچ نیچ بھی عام انتخابات کا سبب بن جاتی ہے۔سیاسی قائدین بھی خوش دلی سے عوامی رائے جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔اور پھر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔

# مارکیٹنگ کی دنیا میں انقلاب

یورپی عوام کی خیرہ کن ترقی کے پیچھے کارفرما وجوہات میں سے ایک اہم وجہ نئی ایجادات کو تکریم دینا، نیز ہر اہم موجد کو سماجی وسرکاری اعزازات سے نوازنا بھی ہے۔ یورپی یونین کے وجود میں آنے کے بعد یورپین پیٹنٹ آفس کا قیام اور اس کا سالانہ جاری کردہ یورپین انوینٹر ایوارڈ اہل مغرب کے نئی ایجادات سے لگاؤ کا مظہر ہے، پچھلے دنوں جاپان سے تعلق رکھنے والے ماساہیرو ہارا اوران کی ٹیم کو یہ یورپی ایجاداتی ایوارڈ دیا گیا۔ اس جاپانی انجینئر اور اس کی ٹیم نے کیوآر (Q.R) کوڈ ایجاد کیا ہے۔ گو کہ چھپن سالہ ہارا نے یہ کیوآر (Q.R) کوڈ دوعشرے قبل 1994ء میں ترتیب دیا تھا لیکن دنیا بھر میں سمارٹ فون کی ایجاد کے بعد اس کا استعمال بہت زیادہ بڑھ گیا ہے، اتنا زیادہ کہ اس کے موجد کے لیے بھی حیرت انگیز ہے۔

آج کل پاکستان میں کیوآرکوڈ کا بہت چرچا ہے۔ جدھر دیکھو(Q.R) کوڈ کی

دھوم مچی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ کیوآر کوڈ کی تفہیم کے حوالے سے اب تک کوئی تحقیقی تحریر میری نظر سے تو اب تک نہیں گزری، جس سے پتا چل سکے کہ یہ کیوآر کوڈ ہے کیا بلا؟ یورپی ایجاداتی ادارے کی جانب سے اس کے جاپانی موجد اور اس کی ٹیم کو پاپولر ایوارڈ سے نوازنے کی خبر نظر سے گزری تو میں نے سوچا کہ اسی انعام کے بہانے اپنے قارئین سے کیو آر کوڈ کے موضوع پر گپ شپ کرتے ہیں۔ یہاں سر راہ تذکرہ کرتا چلوں کہ یورپی پیٹنٹ آفس بنیادی طور پر نئی ایجادات کے جملہ حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرنے والا ادارہ ہے۔ یہ دفتر نئی ایجاد ہونے والی اشیاء کی بابت درخواستیں وصول کر کے ان کی جانچ پڑتال کرتا ہے ،بعد ازاں منتخب شدہ درخواستوں کو قبول کر کے ان چیزوں کو یہ جملہ حقوق فراہم کر دیتا ہے جو دنیا بھر میں پھر یورپی پیٹنٹ کہلاتی ہیں۔علاوہ ازیں اس ادارے نے دنیا بھر کے موجدین کی حوصلہ افزائی کے لیے سالانہ ایوارڈ کا اجرا بھی کر رکھا ہے۔یہی یورپی ایوارڈ پانے والے موجد جاپانی انجینئر اور ان کی ٹیم نے جو کیوآر کوڈ بنایا ہے وہ اس سے پہلے مستعمل بارکوڈ سے کئی لحاظ سے بہتر ہے۔گرچہ یہ بھی بارکوڈ کی ایک قسم ہی ہے۔

بارکوڈ کی بابت چند باتیں جاننا اہم ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کوڈ کو پڑھنے کیلئے کیمرہ یا پھر سکینر ضروری ہے۔ یہ کیمرہ یا سکینر کسی کمپیوٹر، موبائل یا پھر دیگر مشین کے ساتھ منسلک ہوتا ہے، جس میں ڈیٹا ذخیرہ ہوتا ہے۔دوسری بات انٹرنیٹ کے ساتھ مذکورہ مشین کا کنکشن ہے گوکہ انٹرنیٹ سے منسلک ہونا لازمی امر تو نہیں ہے، ابتدا میں جو بارکوڈ ایجاد کیے گئے وہ ڈیٹا مشین کے اندر موجود معلومات کی مدد سے سکین کرنے پر کام کرتے تھے،مثلاً یہ کہ کسی سپر سٹور میں موجود اشیاء کی قیمت فروخت کیا ہے؟ کون سی چیز سٹاک میں کتنی مقدار میں رکھی پڑی ہے اور کہاں رکھی گئی ہے وغیرہ وغیرہ ،مگر جیسے جیسے دنیا میں انٹرنیٹ کا رواج عام ہوتا گیا، ویسے ویسے ہی نئی طرز کے کوڈ ایجاد ہونے لگے، جو فوراً انٹرنیٹ سے منسلک کر

دیتے ہیں۔(Q.R)کوڈ کو آج دنیا بھر میں ان سب سے زیادہ مقبول، تیز رفتار اور قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔جو کہ کوئیک رسپونس کوڈ کا مخفف ہے۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے، یہ فوری معلومات کی فراہمی کیلئے ترتیب دیا گیا بارکوڈ ہے۔سفید پس منظر میں سیاہ رنگ کے چوکور خانوں میں نقطوں کی طرح نظر آنے والے اس کوڈ کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ اس کے تین کونوں پر دوہرے مربع نمانشان ہوتے ہیں جو اس کو اردگرد کے مواد سے ممتاز کر کے پڑھنے میں آسان بنا دیتے ہیں۔(Q.R)کوڈ کا یہی امتیاز اس کے موجد کے نزدیک اس کی مقبولیت کی بنیادی وجہ بھی ہے۔

کیو آر کوڈ بنیادی طور پر مشین سے پڑھا جا سکنے والا ایسا لیبل ہوتا ہے جس کے اندر اس چیز کے متعلق مکمل معلومات ہوتی ہیں جس پر یہ چسپاں کیا گیا ہے۔ابتدا میں اس کوڈ کو گاڑیوں کے پرزے بنانے والی صنعت میں استعمال کرنے کیلئے ایجاد کیا گیا تھا۔یاد رہے کہ اس کے موجد گزشتہ 36 برس سے گاڑیوں کے فاضل پرزے بنانے والی کمپنی میں ملازم ہیں۔سادہ الفاظ میں موجد کی یہ ایجاد ایک کارپوریشن کی مرہون منت ہے جس نے اس کام کیلئے مذکورہ انجینئر کو بھرتی کیا۔میں ذاتی طور پر بھی چونکہ ری کنڈیشن گاڑیوں میں دلچسپی رکھتا ہوں اور اسی کاروبار سے وابستہ ہوں اس لیے فاضل پرزوں کی شناخت کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔یہ بارکوڈ اپنے ابتدائی شعبے میں کامیابی کے بعد جب دیگر شعبوں میں آزمایا گیا تو اپنی رفتار، آسان استعمال اور وسعت کے سبب کامیاب ٹھہرا۔مارکیٹنگ کے شعبے میں تو اس نے دنیا بھر میں گویا انقلاب برپا کر دیا ہے۔ابھی ابھی میرے گھر کے دروازے میں ڈاک کیلئے بنائے گئے دو انچ چوڑے اور آٹھ انچ لمبے سوراخ سے جو جاپان میں ہر فلیٹ کا لازمی حصہ ہے، تازہ ڈاک اندر آئی ہے، دیگر مراسلوں کے ہمراہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ محلے کی نئی نائی کی دکان کا بھی آیا ہے۔اس پر بھی کیو آر کوڈ بنا ہے جیسے ہی میں نے

اس بارکوڈ پر موبائل فون کے کیمرے کو فوکس کیا ہے تو نا صرف اس دوکان کی ویب سائیٹ بلکہ نقشہ، تصاویر، نرخ نامہ، نصب العین، اہم خوبیاں اور حجام کی اپنی نوعمر اسسٹنٹ نائی کے ساتھ تصاویر فوری طور پر میرے موبائل فون کی سکرین پر آ گئی ہیں۔ میں نے اپنے فلیٹ کا ذکر کیا ہے، مکان کا نہیں، کیونکہ جاپان کے روایتی مکانات میں دروازے پر چٹخنی، کنڈی اور تالا نہیں ہوتا ہے جس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس سماج میں تاریخ کے کسی لمحے پر بھی چوری کا رواج نہیں تھا۔

یہاں میں روایتی مکانات اور کثیر المنزلہ عمارتوں کے جدید رہائشی فلیٹس کا تذکرہ بے جا نہیں کر رہا ہوں، (Q.R) کوڈ کے موجد کا کہنا ہے کہ اس قسم کے بارکوڈ کا خیال اس کے ذہن میں یوں آیا کہ ایک دفعہ ریل گاڑی پر اپنے دفتر جاتے ہوئے ایک ایسے مصروف علاقے سے گزرا جہاں گنجان آباد روایتی مکانات کے بیچ بلند و بالا عمارات کھڑی تھیں۔ سچ پوچھیں تو یہی منظر اس کوڈ کی ایجاد کا موجب بنا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب بھی (Q.R) کوڈ کو دیکھیں تو پست و بلند عمارات کے ایک رہائشی علاقے کا گمان گزرتا ہے۔ اپنی ایجاد پر یورپی ایوارڈ وصول کرتے ہوئے جاپانی انجینئر کا کہنا تھا کہ وہ کیو آر کوڈ کو مزید ترقی دینا چاہتا ہے۔ اسے بہتر بنانا اور پوری دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے تاکہ لوگوں کی زندگی میں کچھ آسانی پیدا کرنے کا سامان ہو سکے۔
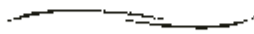
# روماجی

پہلے پہل روماجی کا لفظ سن کر ناتا جی، باؤ جی اور اسی طرح کے دیگر فلمی خیالات میرے ذہن میں آئے تھے۔ یہ تو بعد میں عقدہ کھلا کہ یہ معاملہ فلمی نہیں علمی نوعیت کا ہے۔ پاکستان چونکہ تاج برطانیہ کی عملداری سے آزاد ہوا، اسی لئے ہمارے ہاں رومن رسم الخط میں لکھی گئی ہر تحریر کو انگریزی کہہ کر معاملہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ جاپان میں صورت حال ذرا مختلف ہے۔ یہاں انگریزی دیگر یورپی زبانوں کی طرح فقط ایک غیر ملکی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا یہاں رومن رسم الخط میں لکھی ہر تحریر کو انگریزی نہیں کہا جاتا، بلکہ رومن حروف تہجی اور عبارت ''روماجی'' کہلاتی ہے۔

جاپان میں مقیم غیر ملکی تارکین وطن کے لئے ''روماجی'' کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں تو بیرونی ممالک سے آکر جاپان میں بسنے والے پردیسیوں کی غالب اکثریت ان پڑھ کہلائے گی۔ گرچہ جاپانی رسم الخط تین طرح کے ہیں، مگر تینوں ایک سے بڑھ کر ایک مشکل ہے۔ سب سے جان لیوا تو چین سے کئی صدیاں پہلے درآمد کردہ رسم

الخط ''کھانجی'' ہے ، جوکہ بنیادی طور پر تصاویری ہے۔ان تصاویر کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔اب ایسے بے شمار حروف تہجی کی موجودگی میں بھلا کوئی غیر ملکی کہاں تک سیکھے۔دیگر دو رسم الخط ''ہیرا گانا'' اور ''کھا تا گانا'' کہلاتے ہیں،جن کی تعداد باون،باون ہے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ یہاں ہر تحریر ان تینوں رسم الخطوط کو ملا کر ہی لکھی جاتی ہے۔لہٰذا نستعلیق جاپانی پڑھنے کے لئے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے۔

گوکہ انگریزی نے اپنی اہمیت کو جیسے باقی دنیا میں منوایا ہے ویسے ہی جاپانی بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔بچوں کو سرکاری و نجی سکولوں میں لازمی مضمون کے طور پر پڑھانے کے لئے انگریزی اہلِ زبان اساتذہ کو بھاری مشاہرے پر جاپان بلوایا جاتا ہے،مگر سالہا سال کی سر توڑ کوششوں کے باوجود یہ منصوبہ نا کام دکھائی دیتا ہے۔اگر چہ بہت ساری جاپانی خواتین انگریزی سیکھنے کی سر توڑ کوشش میں غیر ملکی مردوں کے ساتھ رشتہء ازدواج میں منسلک ہو چکی ہیں۔مگر انگریزی کا چلن اس ملک میں نہیں ہوسکا۔امریکہ کے زیر نگیں ریاست پورٹو ریکو سے آئی ایک انگریزی کی استانی نے مجھے بتایا کہ جاپانی بچوں کو انگریزی سکھانا ناممکن ہے۔وہ تو اس قدر جھنجھلائی ہوئی تھی کہ جاپانی نسل کے تمام نونہالوں کو ہی ''ناممکن'' قرار دینے پر تلی ہوئی تھی۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انگریزی کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود جاپانیوں کا انگریزی زبان میں ہاتھ خاصا تنگ ہے۔مجھ سے اگر کوئی اس تنگ دامنی کا سبب پوچھے تو مختصر ترین الفاظ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ''جاپان بہت جاپانی ہے''۔بیرونی دنیا کے اثرات اس خطہ ارض تک بہت کم پہنچے ہیں،ماضی قریب میں تین صدیوں تک ملک کی سرحدیں مکمل طور پر بند رہیں۔اس کے نتیجے میں دنیا سے الگ تھلگ جزیروں کے جھرمٹ پر مشتمل اس ملک پر غیر ملکی اثرات بھی بہت ہی محدود ہو گئے۔ان تین صدیوں کی تنہائی ، جسے امریکہ بہادر نے زبردستی 1854ء میں جنگ کی دھمکی دیکر ختم

کیا تھا، اس عالمی تنہائی کے اثرات لوگوں کی نفسیات، رویوں اور ہر شعبہ زندگی میں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ کچھ سال پہلے تک پورے جاپان میں ریلوے اسٹیشنوں اور سڑکوں کے ناموں سے لے کر ہر سرکاری وغیر سرکاری بورڈ صرف جاپانی زبان میں ہی تحریر ہوتا تھا۔ جب سے سیاحت کے فروغ کے لئے یہ قانون پاس ہوا ہے کہ سرکاری بورڈوں پر روماجی یعنی رومی رسم الخط میں بھی عبارت تحریر کی جائے، تب سے غیر ملکیوں کے لئے بڑی آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ ورنہ تارکینِ وطن اپنی گلی، محلے کے نام کا کا بورڈ تک نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ریل کا اسٹیشن بھی پردیسی لوگ اندازے سے ہی اتر جاتے تھے، اور یہ اندازہ ہمیشہ صحیح بھی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی گھر سے ایک اسٹیشن آگے نکل جاتے، تو کبھی دو اسٹیشن پہلے ہی گاڑی سے اتر جاتے تھے۔

یہاں پر رومن رسم الخط اور زبان کی وضاحت برمحل ہوگی۔ قدیم سلطنتِ روم کی زبان بذاتِ خود تو ناپید ہوتی جا رہی ہے، مگر اس زبان کا رسم الخط پوری دنیا میں رواج پا گیا ہے۔ ویٹی کن سٹی میں پاپائے اعظم اور ان کے قریبی رفقاء اب بھی اپنا رسمی خطبہ لاطینی زبان میں دیتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید قدیم عیسائی روایت ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں یروشلم اور عرب کا زیادہ تر حصہ قدیمی رومی سلطنت کے زیرِ تسلط تھا۔ ابنِ مریمؑ کو مصلوب بھی روما کی سلطنت کے نمائندے کے حکم پر کیا گیا تھا۔ یہ الگ معجزہ ہے اس واقعے کے کچھ سال بعد رومن شاہی خاندان نے خود عیسائیت قبول کر لی۔ تب سے اٹلی عیسائی مذہب کے سب سے بڑے فرقے رومن کیتھولک کا مرکز ہے۔ قدیم روما کی زبان لاطینی سے چار بڑی یورپی زبانوں کا جنم ہوا۔ ان میں پرتگالی، ہسپانوی، اطالوی اور رومانوی شامل ہیں۔ لاطینی امریکہ کے خطے

کو اسی لسانی بنیاد پر یہ نام دیا گیا ہے، چونکہ وہاں ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں بولی جاتی ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ لاطینی امریکہ کوئی جغرافیائی خطہ نہیں ہے بلکہ یہ براعظم شمالی وجنوبی امریکہ کے وہ ممالک ہیں جہاں لاطینی زبان سے اخذ کردہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جاپان میں گزشتہ چند سالوں کے دوران رومن رسم الخط نے بڑی تیزی سے رواج پایا ہے۔ ترویج تو رومن اردو رسم الخط کی پاکستان میں بھی بہت زیادہ تیزی سے ہوئی اور ہورہی ہے، مگر ہمارے ہاں تو یہ موبائل فون ٹیکسٹ اور سوشل میڈیا کی مقبولیت کے باعث ہورہا ہے۔ یہاں صورتحال اور اسباب مختلف ہیں۔ سبب چاہے جو بھی ہو مگر جب سے روما جی کا چلن عام ہوا ہے، غیر ملکیوں کی جاپان میں زندگی بہت آسان ہوگئی ہے۔
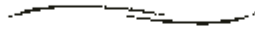
# جاپان کے اُردو سائن بورڈ

بظاہر تو اردوزبان اور جاپان میں کوئی تال میل، جوڑ نظر نہیں آتا۔ حقیقت مگر ذرا مختلف ہے۔ جاپانی سرزمین اردوزبان کے لئے نہ تو اجنبی ہے اور نہ ہی نئی ہے۔ تحقیق کے مطابق یہاں اردو کی تاریخ سن 1796 عیسوی میں اردوزبان کی ایک لغت کی تیاری سے شروع ہوتی ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں شعبہء اردو پاکستان کے قیام سے بھی بہت پہلے سے قائم ہے۔ قیام کے ابتدائی دور میں اس کو ہندوستانی زبان کا شعبہ کہا جاتا تھا، مگر بعد ازاں اس کا نام تبدیل کر کے شعبہ اردو رکھ دیا گیا۔ اس وقت جاپان کے تین بڑے شہروں ٹوکیو، اوساکا اور سائی تاما کی جامعات میں شعبہء اردو موجود ہیں، جن میں بہت سارے مقامی طلباء وطالبات اردوزبان سیکھنے میں سرگرداں ہیں۔ ٹوکیو یونیورسٹی، دائتو بنکا یونیورسٹی اور اوساکا انٹرنیشنل یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سربراہان اور اور سٹاف کی غالب اکثریت جاپانی النسل ہیں۔ مگر سب فرفر، روانی سے اردو بولتے ہیں۔ تقریباً تمام اساتذہ کرام پاکستان کے تعلیمی داروں سے فارغ التحصیل ہیں۔ کچھ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے، تو

کچھ جامعہ کراچی سے پڑھے ہیں۔اردو زبان سے متعلق ایک منظر مگر یہاں ان جاپانی درس گاہوں سے باہر کا ہے۔میرے ساتھ یہاں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ اردو میں تحریر کردہ کوئی سائن بورڈ دیکھتا ہوں اور ٹھٹک جاتا ہوں۔موضوع ایسا ہے کہ پڑھنے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔کہتے ہیں ایک تصویر تحریر کئے ہوئے پانچ سو الفاظ کے برابر ہوتی ہے۔جاپان کے مختلف شہروں میں آویزاں، اردو زبان میں تحریر کردہ یہ سائن بورڈ دیکھ کر آپ کو اردو زبان کی اہمیت اور وسعت کا بھی اندازہ ہوگا۔اردو کے یہ سائن بورڈ زیادہ تر سرکاری ہیں۔کچھ نیم سرکاری اور غیر سرکاری بھی ہیں۔مجھے امید ہے ہمارے تمام قارئین کو یہ تصاویر پسند آئیں گی۔
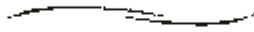
# اوشی بانا

جس طرح ''بونسائی'' کا فن جاپانیوں کے فطرت سے لگاؤ کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ آرٹ کا حصہ بھی ہے، جس میں پودے کی اس طرح تراش خراش کی جاتی ہے کہ سالہا سال، بلکہ بعض اوقات صدیوں کی عمر پانے کے باوجود پودے کا قد چند انچ سے زیادہ اونچا نہیں ہونے پاتا۔ جاپان کا قومی ورثہ سمجھے جانے والے ان ٹھگنے پودوں کی ملک سے برآمد قابل تعزیر جرم ہے۔ قومی اثاثہ قرار دیئے گئے ان بونے پودوں کی قیمت لاکھوں اور بعض اوقات کروڑوں روپے میں ہوتی ہے۔ معزز خاندانوں میں نسل در نسل ان چند انچ اونچائی کے پودوں کی افزائش کی جاتی ہے۔ ان کے برگ و ثمن کی تراش خراش کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح ''آکے بانا'' پھولوں کی آرائش و ترتیب کا فن ہے، جس کی باقاعدہ تعلیمی اداروں میں تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ کچھ ان سے ملتا جلتا فن ''اوشی بانا'' کا بھی ہے۔ بنیادی طور پر تو یہ بھی پھول پتیاں سجانے اور ان سے فن پارے تخلیق کرنے کا فن ہے، مگر آرٹ کے اس شعبے کی خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ تازہ پھولوں اور

پتیوں کو فنکارانہ حسنِ ترتیب بخشنے کے بعد آرائشی فریموں میں ایسے مخصوص انداز سے پیک کیا جاتا ہے کہ برسہابرس بیت جانے کے باوجود پھول سوکھتے اور مرجھاتے نہیں ہیں۔ ان کی فطرتی تروتازگی اور رنگ، روپ برقرار ودائم رہتے ہیں۔ پھولوں کو تروتازہ رکھنے میں کلیدی کردار تو فریم ادا کرتے ہیں۔ فن پاروں کی صورت میں ڈھلنے کے بعد گل وسمن کو ایسے میٹریل سے بنے فریم میں بند کیا جاتا ہے جو کہ ہر طرح کے موسمی اور دیگر بیرونی اثرات سے ان کو محفوظ بنادیتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں فریم کے اندر موجود تمام ہوا کو خارج کر دیا جاتا ہے، گویا ایک مصنوعی خلا ان پھول وپتیوں کے اردگرد قائم کر دیا جاتا ہے۔ اس فن کو یہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں ''اوشی بابا'' کی تربیت دینے کے لئے کلاسز ہوتی ہیں۔ معیاری شہ پاروں کو آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ نیپال سے تعلق رکھنے والی خاتون سپنا سلوال میرے دوست درما پرساد کی اہلیہ اور ''اوشی بابا'' کے فن میں ماہر مانی جاتی ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے تخلیق کردہ فن پاروں کو سرکاری آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے پیش کیا گیا۔ ان کی دعوت پر میں یہ نمائش دیکھنے گیا، ان میں سے چند فن پاروں کی تصاویر قارئین کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔
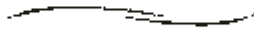
حصہ دوم

# ہفت اقلیم

# تھائی لینڈ - دیس اچھا مگر بدنام بہت ہے

تھائی لینڈ کا مقامی زبان میں لفظی ترجمہ ''مردآزاد'' ہے، اور بنکاک پہنچتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ اس ملک کا نام تھائی لینڈ ہی ہونا چاہیئے تھا۔یہاں کا موسم ایسا خوبصورت ہے کہ اگر کسی گرم ملک سے آئیں تو آپکو خنکی محسوس ہوتی ہے اور کسی برفیلے دیس کے لوگ جب یہاں پہنچتے ہیں تو گرمی محسوس کرتے ہیں ۔مقامی لوگ پرامن ،منکسر المزاج ،خدمت گزاراور بردبار ہیں، جوکہ شاید بدھ مت کے پیروکار ہونے کے سبب سے ہے۔ملکی آبادی کا %94 فیصد حصہ بدھ دھرم کے ماننے والوں کا ہے، جوکہ انڈوپاک کے مشہور بادشاہ اشوک اعظم کے دور میں اسکی خصوصی کاوشوں سے یہاں پہنچا تھا۔پانچ فیصد مسلمان اور ایک فیصد آبادی دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی ہے۔اس میں عیسائیوں، ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ ایک ہزار افراد یہودی مذہب کے ماننے والے بھی ہیں ۔سرسبز وشاداب پہاڑوں، جنگلوں اور خوبصورت ساحلوں پر مشتمل اس ملک کا المیہ یہ ہے کہ اس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔آدمی اگر کسی نیک مقصد کیلئے بھی تھائی لینڈ جا رہا ہو عمومی تاثر یہی بنتا ہے کہ کسی برے کا

م سے جارہا ہے۔زمانہ طالب علمی میں پہلی مرتبہ جب میں کالج کے ہم مکتب ساتھیوں کے ہمراہ سیاحتی دورے کی غرض سے تھائی لینڈ جانے لگا تو بہت سے بہی خواہوں کوتشویش لاحق ہوئی،بعض نے تو استفسار بھی کیا کہ شریف آدمی بنکاک کیا لینے جارہے ہو؟

تھائی لینڈ کا یہ تاثر بلا جواز اور بے سبب بھی نہیں ہے۔سات کروڑ نفوس پر مشتمل اس ملک کوعشرت کدوں کے حوالے سے عالمی شہرت اس وقت ملی جب امریکی فوجیں ویت نام میں داخل ہوئیں۔ویت نام کے محاذ سے تھکے ہارے امریکی فوجی چھٹیاں منانے کیلئے جوق در جوق ہمسایہ ملک تھائی لینڈ آنے لگے،ان فوجیوں کی تفریح طلبی سے بہت ساری سیاحتی سرگرمیوں کے علاوہ میینہ ہل چل بھی فروغ پانے لگی۔حکومتی سرپرستی اور قانونی تحفظ کے سبب غیر ملکیوں کی تفریح طبع کیلئے قائم کیے گئے مراکز نے باقاعدہ انڈسٹری کی شکل اختیار کرلی ہے۔دوسری عالمی جنگ میں تھائی لینڈ نے جاپان کا ساتھ دیا تھا،یہ جنوب مشرقی ایشیاءکا واحد ملک ہے جو کبھی کسی سامراجی قوت کی نوآبادی نہیں رہا۔جاپان کا ساتھ دینے کا سبب تو یہ معاہدہ تھا کہ برطانیہ اور فرانس نے اس کے جن علاقوں پر قبضہ کررکھا ہے،جاپان انہیں واگزار کرانے میں تھائی لینڈ کی مدد کرے گا،مگر جنگ میں شکست کے بعد معیشت بری طرح گراوٹ کا شکار ہوگئی۔ویت نام میں امریکہ کی آمد کوتھائی لینڈ نے اپنی بدحال معیشت کو بحال کرنے کیلئے بھرپور استعمال کیا۔اس طویل جنگ کا نتیجہ تو امریکی شکست کی صورت میں سامنے آیا،مگر دوران جنگ تھائی لینڈ اپنی معیشت اور سیاحتی انڈسٹری کومضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔اس کا مظہر مقامی کرنسی ’’بھات‘‘ کی مضبوطی بھی ہے،جو کبھی بے وقعت خیال کی جاتی تھی،آج ایک بھات تین پاکستانی روپے کے برابر قیمت کا حامل ہے۔

ملکی شہرت کی بات کریں تو ہمارے عالمی تاثر کے بھی رنگا رنگ پہلو ہیں قوس و

قوسِ قزح کی طرح متنوع۔ تھائی لینڈ کے بنکاک انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر فلائیٹ کے انتظار میں ایک ہم وطن پاکستانی دوست اور میں مٹر گشت کر رہے تھے کہ بیلجیم کی ایک لڑکی سے ہماری مڈبھیڑ ہوگئی۔ ابتدائی رسمی تعارف کے بعد پوچھنے لگی کہ تم لوگ کس ملک کے باشندے ہو؟ میں نے بتایا کہ ہمارا تعلق پاک سرزمین سے ہے۔ پاکستان کا نام سن کر اس لڑکی نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ ہاتھ کو بوسہ دینے کے بعد کہنے لگی کہ ''آپ لوگ عظیم ہیں'' سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی قومی عظمت کا اس قدر والہانہ اظہار و اعتراف اس سے قبل میں نے اپنی زندگی میں کسی غیر ملکی کی زبانی نہیں سنا تھا۔ ایک سکھ دوست مجھے اکثر ''تسی گریٹ او جی!!'' کہتا رہتا ہے، مگر یہ تو اس کا تکیہ کلام ہے، وہ تو سب کو یہی کہتا رہتا ہے۔ یہاں پر معاملہ مختلف تھا۔ میں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس لڑکی سے پوچھا کہ ہم کس وجہ سے عظیم لوگ ہیں؟ جواباً وہ سنہری بالوں اور نیلی نشیلی آنکھوں والی لڑکی کہنے لگی کہ آپ کے ملک جیسی چرس پوری دنیا میں کوئی نہیں بناتا ہے۔ صورت حال کی گھمبیرتا کو دیکھتے ہوئے پاکستانی دوست کہنے لگا کہ اب یہاں سے کھسکنا بہتر ہے۔

یہاں کے کھانے کچھ تو بہت مزیدار ہیں۔ لیکن زیادہ تر کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں ہے۔ تازہ کوکونٹ اور اس کا فرحت بخش دودھیا رس البتہ ایسی چیز ہے جس کا پوری دنیا میں کوئی نعم البدل نہیں۔ جس ہوٹل میں میرا قیام رہا، اس کے اندر کپڑوں کی دکان کرنے والے ایک سکھ سے میری دوستی ہوگئی۔ خالصتان تحریک کے زوال کا سبب وہ نوجوان لڑکوں کی شہادت اور جلا وطنی بتاتا تھا مگر یہ موضوع پھر کبھی اٹھائیں گے، اس نے کھانوں کے متعلق بڑی اچھی تجویز دی۔ دیسی کھانوں کے مرکز کی بابت اس سے پوچھا تو کہنے لگا یار وہ تو آپ سارا سال کھاتے ہو، پہلے بھی کھا کر آئے ہو اور واپس جا کر بھی وہی کھاؤ گے، یہاں آتے ہو تو تھائی کھانے ٹرائی کرو۔ تھائی سی فوڈ کی اس نے بہت خصوصی تعریف

کی تھی۔ بازار میں بھاؤ تاؤ کا انداز اور ماحول بالکل پاکستان جیسا ہے۔ جو قیمت دوکاندار طلب کرتا ہے۔ اس سے کہیں کم قیمت پر فروخت کرنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔

تک تک یہاں کا روایتی رکشہ ہے، اس کے بغیر تھائی لینڈ کا تذکرہ نامکمل ہے۔ بنکاک میں آمدورفت کا یہ سب سے اہم ذریعہ ہے۔ تک تک ہمارے چاند گاڑی کہلانے والے رکشہ سے قدرے بڑا ہوتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ چاند گاڑی میں پھونک بھر دی جائے اور وہ ایک مربع فٹ پھیل جائے تو تک تک بن جاتا ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کی بات کریں تو غالباً یہ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں پر موٹر سائیکل بھی بطور ٹیکسی استعمال ہوتا ہے۔ موٹر سائیکل ٹیکسی بنکاک میں زیادہ مقبول ہے جس کی وجہ اس شہر کی بے ہنگم ٹریفک ہے۔ بنکاک کو ٹریفک کے بہاؤ کے اعتبار سے دنیا کا سب سے برا شہر بھی کہیں تو مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ پاکستان میں ٹریفک کا نظام یہاں سے بدرجہا بہتر اور متوازن ہے۔ بنکاک میں اگر آپ ٹریفک میں پھنس گئے تو پتہ نہیں کب نکلیں گے، دو، چار گھنٹے تو معمولی بات ہے، آٹھ، دس گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ فضائی آلودگی اس شہر کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہاں سے ایک گھنٹے کی مسافت پر پتایا کہ سفید ریت کا حامل خوبصورت ساحل اور چھوٹا سا شہر ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اگر آپ تھائی لینڈ جائیں تو بنکاک کی بجائے پتایا کے ساحل پر زیادہ وقت گزاریں۔ ملک میں آئینی طور پر بادشاہت ہے اور پارلیمانی نظام آئین کا حصہ ہے جو کہ برطانیہ اور جاپان سے مماثلت رکھتا ہے، یہاں بادشاہ کو مذہبی تکریم حاصل ہے، لوگ اس سے بہت محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ آج کل جمہوریت موقوف ہے اور فوج کا راج ہے۔
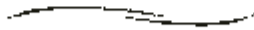
# سری لنکا ۔ امن اور خوشحالی کی راہ پر گامزن

سری لنکا کا نام سنتے ہی ذہن میں عموماً کرکٹ، ریڈیو سیلون، چائے یا پھر تامل ٹائیگرز کا خیال آتا ہے۔ کولمبو ائیر پورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی طرف جاتے ہوئے اندازہ ہوا کہ کسی بھی ملک کی عالمی شناخت کے پہلو تو مختصر ہو سکتے ہیں مگر حقیقت میں ہر دیس متنوع مزاج رکھتا ہے۔ پچیس ہزار مربع میل کے اس سرسبز و شاداب جزیرے کے زمینی ہمسائے تو نہیں ہیں، فقط سمندری حدود ہے جو کہ بھارت اور مالدیپ کے ساتھ ملتی ہیں۔ دو کروڑ آبادی کا یہ ملک مجھے پہلی نظر میں بے حد مذہبی رجحان کا حامل دکھائی دیا۔ فی مربع میٹر عبادت گاہوں کی اتنی زیادہ تعداد اور تنوع میں نے دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں دیکھا۔ کل آبادی کا ستر فیصد بدھ مت کا پیروکار ہے اور تیرہ فیصد لوگ ہندو دھرم کے ماننے والے ہیں، مگر معاشرے میں مذہب کا عنصر اتنا اہم ہے کہ عیسائی ملکی آبادی کا فقط سات فیصد ہیں، اس کے باوجود کولمبو میں جتنے گرجا گھر اور دیگر نصرانی علامات میں نے دیکھی ہیں، اتنی آج تک کسی عیسائی اکثریت والی ریاست میں بھی نظر نہیں آئیں۔ مسلمان آبادی کا دس

فیصد ہیں، مساجد اور صوفی درگاہوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ شمار کرنا مشکل ہے۔ بدھ معبد، مندر، کلیسا، اور مساجد کی اتنی بڑی تعداد بھی یقیناً ایک وجہ ہوگی جس کے سبب معتبر عالمی تحقیقاتی ادارے ''پیو'' نے سری لنکا کو دنیا کا تیسرا سب سے زیادہ مذہبی رجحان رکھنے والا ملک قرار دیا ہے۔

ریاست کا سرکاری نام سوشلسٹ جمہوریہ سری لنکا ہے، مگر سوشلزم یہاں چین اور یورپ کی طرز کا کھلی منڈی پر مشتمل ہے، شمالی کوریا اور کیوبا کی طرح معیشت پر حکومتی اجارہ داری نہیں ہے۔ چند سال پہلے ہی تیس سالہ طویل خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا ہے جس کے بعد سری لنکا تیزی سے معاشی ترقی کرتا نظر آرہا ہے۔ تامل ٹائیگرز کو جس طرح یہاں فوج نے شکست دی ہے اس سے ہمیں بھی یہ سبق ملتا ہے کہ مسلح گروہوں اور دہشت گردوں کے خاتمے کے لیے مسلح سیکورٹی اداروں کی کاروائی ہی واحد راستہ ہے۔ تامل نسل یہاں کی کل آبادی کا دس، پندرہ فیصد ہے اور مذہبی اعتبار سے ہندو ہیں۔ پچھتر فیصد آبادی سنہالی نسل سے تعلق رکھتی ہے جس میں سے غالب اکثریت بدھ مت ہے۔ سری لنکا میں بدھ مت کی ابتدا کا قصہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اشوک اعظم نے اپنے دورِ حکومت میں تبلیغ کی غرض سے اپنے حقیقی بیٹے کو بدھا کا پیغام دیکر سری لنکا بھیجا۔ لنکا کے راج دربار نے مہاتما بدھ کی تعلیمات کو پسند کیا اور بدھ مت اختیار کر لیا۔ تاریخ کی عجب ستم ظریفی ہے کہ ہندوستان میں یوں تو روزِ اول سے ہندو مذہب اکثریت میں ہے مگر آج تک کوئی ایک نامور حکمران ہندو نہیں گزرا ہے۔ مورخین چھ بادشاہوں پر متفق ہیں کہ وہ سب سے طاقتور اور عظیم و دبنگ گزرے ہیں۔ ان میں سے چندر گپت موریہ جین مت کا پیروکار تھا۔ اس کے بعد اشوکِ عظیم سلطنت کا بانی اور حکمران گزرا جو کہ بدھ مت کا ماننے والا تھا۔ باقی چار بادشاہ مغل مسلمان ہیں۔ اکبرِ اعظم، شاہجہان ''معمار''، جہانگیر ''شرابی'' اورنگزیب ''بنیاد پرست'' تاریخ کہتی ہے کہ یہ چھ سب سے

زیادہ جلیل القدر ہندوستانی شہنشاہ گزرے ہیں۔

ریڈیو سیلون میری پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے مگر یہ ہمارے ادب کا بہت اہم حوالہ ہے۔ ریڈیو سیلون کو ملنے والی اہمیت اور توجہ قابل فہم بھی ہے کیونکہ یہ پورے ایشیاء میں ،جب ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا، تو پہلا ریڈیو اسٹیشن تھا۔ جب تاج برطانیہ نے اپنی اس نو آبادی میں مختلف زبانوں میں ریڈیو سروس شروع کی تو چین، جاپان، ہندوستان سمیت کہیں بھی کوئی ریڈیو اسٹیشن نہیں تھا۔ گو کہ یورپ میں 1920 سے ریڈیو نشریات شروع ہو چکی تھیں۔ یاد رہے کہ سری لنکا کا پرانا نام سیلون تھا۔ 1505 میں جب پرتگال نے اس جزیرہ نما پر قبضہ کیا تو اسے سائی لون کا نام دیا۔ بعد ازاں یہاں ولندیزی حکمران آ گئے۔ بالآخر جب 1815 میں برطانوی قبضہ ہوا تو یہ سیلون کہلانے لگا۔ 1948 میں برطانیہ تو یہاں سے چلا گیا مگر ملک کا نام 1972 تک سیلون ہی رہا اور پھر ریڈیو سیلون ملک کے نام کی تبدیلی کے ساتھ ہی سری لنکا براڈ کاسٹنگ بن گیا۔

سیلون چائے کے باغات پانچ صدیوں پر محیط یورپی نوآبادیاتی عہد کی یادگار ہیں ،یہاں کی چائے اب بھی دنیا بھر میں سری لنکا کی پہچان ہے۔ نوآبادیاتی عہد کے اثرات یہاں ہر شعبہ زندگی پر نظر آتے ہیں۔ طرز تعمیر کی بنیاد پر یہاں کی عمارات ہر عہد کی کہانی سناتی ہیں، زمانہ قدیم، ایرانی، عرب، پرتگالی، ولندیزی، برطانوی اور زمانہ جدید۔ ہندو مذہب کے ماننے والے سری لنکا کو بھگوان کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو کہتے ہیں۔ اگر نقشے میں سری لنکا کا جغرافیہ دیکھیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مہا بھارت میں لکھا ہے کہ راونڑ نے سیتا کو اغواء کر کے یہاں پر ہی قید کیا تھا۔ جب رام نے سیتا کی رہائی کے لیے لنکا پر حملہ بول کر اسے تہس نہس کر ڈالا تو وہیں سے ''لنکا ڈھانے'' کا استعارہ تشکیل پایا۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات جنہیں ''پالی اصول'' کہتے ہیں، پہلی مرتبہ یہاں ہی کتابی شکل میں مرتب ہوئیں۔

کولمبو سے دو گھنٹے کی مسافت پر حضرت آدمؑ کی جائے نزول ہے جسے ADAM PEAK کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ عیسائی مذہب کے پیروکاروں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس پہاڑی چوٹی پر حضرت آدمؑ اترے تھے اور چوٹی پر ثبت نشان ان کے پاؤں کا ہے۔ بدھ بھکشوؤں کا مگر اصرار تھا کہ یہ بدھا کے پاؤں کا نشان ہے۔ اسی سبب سے یہ بھکشوؤں کی جائے عبادت ہے۔ خراب موسم کی وجہ سے میں چوٹی کی زیارت نہیں کر سکا مگر سوچتا رہا کہ مہاتما بدھ تو اپنی زندگی میں کبھی سری لنکا آئے ہی نہیں تھے؟ جہاں تک حضرت آدمؑ کا تعلق ہے تو ان کے بیٹے ہابیل کی قبر تو میں نے شام کے سرحدی شہر زبدانی میں دیکھی تھی، جہاں سے ایک طرف اسرائیل کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور دوسری طرف لبنان کی چوٹیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے ہجرت کر لی ہو۔ سری لنکا کی دستاویزی تاریخ تو تین ہزار سال پرانی ہے مگر ماہرین آثارِ قدیمہ کے نزدیک اس دھرتی کی تاریخ ایک لاکھ پچیس ہزار سال پرانی ہے، یہ انسان کا پہلا مسکن ہے، زمین پر اس کا اولین پڑاؤ۔

سری لنکا کو ایشیاء بھر میں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ پہلا ملک تھا جہاں کوئی خاتون حکمران بنی۔ یہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی پچاس برس پہلے کا واقعہ ہے، جب انورادھاپورا نے لنکا کی زمامِ اقتدار سنبھالی تھی۔ صدارتی محل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ شاہراہ اٹھارہ سال کی طویل بندش کے بعد گزشتہ مہینے عوام کی آمد و رفت کے لیے دوبارہ کھولی گئی ہے۔ رہائش گاہ کے اردگرد مسلح فوجی کمانڈو اپنی پوزیشنیں سنبھالے چاک و چوبند کھڑے ہر طرح کے دہشت گرد حملے سے نمٹنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ اٹھارہ سال پہلے لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام نامی تنظیم سے تعلق رکھنے والے ایک بمبار نے صدارتی محل پر خودکش حملہ کر دیا تھا۔ اس کے فوری ردعمل میں صدارتی محل کے سامنے واقع مرکزی شاہراہ کو عوام الناس کی آمد و رفت کے لیے حفاظتی نقطہ نظر سے

بند کر دیا گیا تھا۔ شہر کے نوآبادیاتی عہد میں تعمیر کیے گئے مرکز میں تین سو میٹر سڑک کے اس ٹکڑے کا کھلنا شہریوں کو آمد و رفت کی سہولت سے زیادہ تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ ربع صدی تک جاری رہنے والی خانہ جنگی، جس میں ایک لاکھ انسانی جانوں کا زیاں ہوا اب ماضی بن چکی ہے، جسے لوگ جلد سے جلد بھلانا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا، اکثریت سنہالی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو عموماً بدھ مت کی پیروکار ہے۔ حکومتی ایوانوں میں بھی انہی کا اثر و نفوذ زیادہ ہے۔ سری لنکا کی مقامی تامل آبادی اور ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تامل مجموعی طور پر ملکی آبادی کا تیرہ فیصد ہیں، یہ ہندو مذہب کے ماننے والے ہیں۔ سنہالی زبان کے بعد تامل دوسری بڑی زبان ہے۔ مسلمان کل آبادی کا دس فیصد ہیں، جو کہ ''مور'' اور ''ملایا'' نسل سے متعلق زیادہ ہیں۔ مسلمان اور عیسائی سنہالی و تامل نسل سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں یہ تذکرہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اردو کا محاورہ ''چوروں کو پڑ گئے مور'' اسی مور نسل سے متعلق ہے۔ پنجاب میں نیلی بار اور جنوبی علاقوں میں بھی مور قبائل آباد ہیں جو زیادہ تر خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بدھ مت ملکی آبادی کا ستر فیصد ہیں اور اسی باعث ملکی وسائل پر ان کا کنٹرول ہونا قابل فہم بات تو ہے مگر اقلیتی آبادی کے مسائل پر عدم توجہی نے ماضی میں بہت سارے مسائل کو جنم دیا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام نامی دہشت گرد تنظیم کی بنیاد یونیورسٹی میں کوٹہ سسٹم کے نفاذ کے ردعمل میں رکھی گئی۔ پھر جافنا کے علاقے میں تامل نسل میئر کے قتل نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان سری لنکا میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے تامل آبادی کو استعمال کیا اور انہیں ابتدا میں وسائل بھی فراہم کیے۔

خودکش حملہ آوروں کی تاریخ یوں تو زمانہ قبل از مسیح جتنی پرانی ہے مگر عہد جدید میں

دوسری عالمی جنگ کے دران جاپانی ہوابازوں نے جنہیں ''کھامی کھازی'' جس کا ترجمہ ''بادخدا'' یا پھر ''ملکوتی ہوا'' کیاجانا چاہیے، اس کی بنیاد رکھی۔ پھر تامل ٹائیگرز نے اسے شدت اور جدت سے ہمکنار کیا۔ یہ خودکش بمبار اگر اپنے مشن میں ناکام ہوجاتے تو اپنے گلے میں پہنا ہوا زہر کا کیپسول نگل جاتے تھے، تا کہ قانون نافذ کرنے والے کسی سرکاری ادارے کے ہاتھ نہ آجائیں۔ بے شار واقعات میں گرفتار ہوتے ہی ان جنگجوؤں نے زہر کا کیپسول نگل لیا اور جان دے دی۔ ان خودکش جنگجوؤں میں مردخواتین کی بھی تخصیص نہیں تھی ،یاد رہے کہ سابق بھارتی وزیر راجیو گاندھی کو خودکش بم حملے میں ہلاک کرنے والی بھی ایک تامل ٹائیگرز کی رکن خاتون تھی۔ بھارت کے ساتھ تامل ٹائیگرز کو یہ گلہ ہے کہ اس نے دوغلی پالیسی اپنائی، پہلے اس تنظیم کو مدد دے کر مضبوط بناتا رہا پھر اسی تنظیم کے خاتمے کے لیے سری لنکا کی حکومت سے معاہدہ کر کے اپنی فوج بھیج دی۔ بنیادی طور پر انڈیا نے سری لنکا میں اپنا اثر ونفوذ بڑھانے کے لیے اس تنظیم کو استعمال کیا تھا۔ ہندوستانی فوج سری لنکا میں امن قائم کرنے میں بری طرح ناکام ہوئی، بالآخر سری لنکا کی اپنی فوج نے ہی یہ مشکل جنگ لڑی اور فتح یاب ہوئی۔

چند برس پہلے میری ملاقات کولمبیا کی باغی تنظیم فارس کی ایک خاتون رکن سے ملاقات ہوئی تھی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک سوشلسٹ انقلاب کے لیے عسکری جدوجہد کرنے والی یہ تنظیم گزشتہ برسوں میں مسلسل کمزور ہورہی ہے۔ ''فورسا آرمادا ریولو سینار یا کولمبایانا'' کی رکن سے ملاقات کا کوئی ایسا خاص واقعہ مت سمجھے، کولمبیا کی تمام تر دیہی آبادی ہی عملی طور پر فارس کی رکن ہے، جہاں جہاں شہری حدود ختم ہوتی ہے

حکومت کی عملداری بھی ختم ہوجاتی ہے۔ میں نے مذکورہ خاتون سے انقلابی تحریک کے روبہ زوال ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ''نیویارک میں 11

ستمبر 2001 کو پیش آنے والا واقعہ'' مجھے اس کا یہ جواب عجیب سا لگا، بھلا امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے اغوا شدہ طیاروں کے ٹکرانے کا کولمبیا کے عسکریت پسندوں کے ساتھ کیا لینا دینا؟ میرے سوال کو غور سے سننے کے بعد گبریلا امی یہ خاتون سنجیدگی سے بولی کہ 11 ستمبر کو پیش آنے والے دہشت گردی کے واقعے کے بعد دنیا تبدیل ہو چکی ہے۔ اس سانحے کے رونما ہونے سے پیش تر امریکہ دنیا بھر میں انسانی حقوق کا علمبردار ہونے کا دعوے دار تھا۔ جیسے ہی کسی ملک کے عسکری ادارے اپنے شہریوں کے خلاف کسی قسم کی مسلح کاروائی شروع کرتے، تو امریکہ بہادر انسانی حقوق کی پامالی کا شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا، مگر 11 ستمبر کے بعد انسانی حقوق کا منتر پس منظر میں چلا گیا اور دہشت گردی کے خلاف جنگ اولین ترجیح بن گئی۔ ایسے عالم میں فارس اور اس نوع کی دیگر تنظیموں کے خلاف ریاستی اداروں کی کاروائی کے لیے ماحول سازگار بن گیا۔ وہ امریکہ جو کبھی انسانی حقوق اور شخصی آزادیوں کا چیمپئن کہلانا پسند کرتا تھا، اب مسلح گروہوں کے خاتمے کے لیے شورش زدہ ممالک کو مالی و عسکری امداد دینے لگا ہے۔ میرے خیال میں تامل ٹائیگرز کے خاتمے کی دیگر وجوہات کے علاوہ امریکہ کا یہی بدلا ہوا رویہ بھی اہم وجہ ہے۔ سری لنکا میں خانہ جنگی کے آخری سال چالیس ہزار افراد سیکیورٹی اداروں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے مگر اقوام متحدہ سمیت کہیں بھی کسی نے ان میں سے ماورائے عدالت قتل ہونے والوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

تامل ٹائیگرز کے خاتمے اور امن قائم کرنے میں پاکستانی فوج نے سری لنکن آرمی کی بہت مدد کی ہے۔ یہ بات مجھے ایک ذمہ دار شخص نے یہاں بتائی، تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں۔ درد مشترک تو یہ ہے کہ دونوں ممالک ہی اندرونی دہشت گردی کا نشانہ بنے ہیں۔ تامل ٹائیگرز کو شکست دینے والے فاتح سابق صدر راجا پکسے صدارتی انتخاب ہار گئے۔ لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ سری لنکا میں امن لیکر آئے ہیں۔ ایک دوکاندار

نے مجھ سے کہا کہ راجا پکسے ہمارے بھگوان ہیں، مگر اب انہیں آرام کرنا چاہیے۔ ایک ستم ظریف نے تو یہ بھی کہا کہ اس نے کافی پیسے بنالیے۔ اب کسی اور کوموقع دینا چاہیے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ لوگ خانہ جنگی کے عہد کوفراموش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پچھلے دنوں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں جنگ کے ہیرو جرنیل کی سیاسی جماعت نے بھی حصہ لیا مگر جنگ کا فاتح الیکشن میں بری طرح ہار گیا۔ سابق صدر کی پارٹی بھی بلدیاتی انتخاب میں شکست فاش سے دوچار ہوئی۔ اب ہر سیاسی لیڈر میں نیلسن منڈیلا جیسا ظرف اور حوصلہ کہاں ہوتا ہے، کہ اپنے اقتدار کے عروج اور سیاسی نقطہ کمال پر ریٹائرمنٹ کا اعلان کر کے اقتدار عوام کے دیگر نمائندوں کے سپرد کر دے۔ اور پھر سیاست میں مداخلت بھی نہ کرے۔ تیسری دنیا کے سیاسی قائدین کا المیہ ہے کہ جب تک جوتے یا گندے انڈے ان کے سر پر نہ پڑیں، انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں میں اپنی مقبولیت کھو چکے ہیں۔ سری لنکا میں صدارتی نظام حکومت ہے۔ صدر پانچ سال کے لیے منتخب ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ اس عہدے پر براجمان رہ سکتا ہے۔

میں جس جگہ بیٹھا یہ سطور تحریر کر رہا ہوں، نوآبادیاتی عہد کے تعمیر کردہ بنگلوں کے جھرمٹ پر مشتمل اس علاقے کو ہوٹل کہتے ہوئے جھجک محسوس کر رہا ہوں۔ مگر چونکہ عارضی قیام کی رہائش گاہ کے لیے ہوٹل کا لفظ ہی مستعمل ہے، اس لیے کولمبو کے تر ملین بنگلوز کو ہوٹل کہا جا سکتا ہے۔ یہاں دو، تین اور چار بنگلوں کے مختلف سیٹ بنے ہوئے ہیں۔ بڑا سا لونگ روم، ماسٹر بیڈروم اور باتھ روم، سب کچھ بہت ہی کشادہ ہے اور لان میں سجی کرسیاں تو اسے شاہی رنگ و روپ دے رہی ہے۔ سینکڑوں ایکڑ اراضی پر پھیلے اس ہرے بھرے رقبے میں کوئی بھی عمارت کثیر منزلہ نہیں، سب یک منزلہ عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ میرے آگے پیچھے بنگلوں میں جرمن جوڑے اقامت پذیر ہیں۔ استقبالیہ پر بھی جرمنی سے

آئے ہوئے سیاحوں کو اپنی اپنی باری کا منتظر پایا اور سوئمنگ پول پر بھی جرمنوں کا راج تھا۔ ان کے بعد دوسرے درجے پر بات کریں تو عرب سیاح بھی کثیر تعداد میں اس ملک کا رخ کرتے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ جرمن اور عرب اس سرزمین پر طویل عرصے تک حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ کولمبو کا ڈچ ہسپتال اسی نوآبادیاتی عہد کی یادگار ہے۔ اسپتال تو یہ اب صرف نام کا ہے، آجکل یہ ایک مقبول سیاحتی مرکز میں تبدیل ہو چکا ہے، یہاں پر کثیر تعداد میں انواع اقسام کے ریستوران دن بھر اور میکدے شب بھر سیاحوں کا دل بہلاتے ہیں۔

میں حیرت اور اسرار سے اتنی بڑی تعداد میں جاپانیوں کی اس دیس میں سیاحت کی غرض سے آمد کا سبب جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اب تو پھر بھی امن کا دور دورہ ہے، خانہ جنگی کے طویل عرصے کے دوران بھی اہل جاپان کافی بڑی تعداد میں یہاں آتے جاتے رہے۔ یہ بات حیرت انگیز اس لیے ہے کہ جاپانی امن پسند اور امن پسندی کے پرچارک ہونے کے ساتھ ساتھ جنگ زدہ علاقوں سے بھی دور بھاگتے ہیں،

حد درجہ احتیاط پسند واقع ہوئے ہیں۔ زبان مختلف، ثقافت بالکل الگ طرز کی، اس کے باوجود سری لنکا کے علاوہ فقط تھائی لینڈ میں جاپانی اتنی کثیر تعداد میں دیکھے ہیں۔ ہاں ایک بات سمجھ میں آتی ہے، غالباً بدھ مت وہ مشترک ورثہ اور شناخت ہے جو ان دونوں ملکوں میں قربت کا سبب لگتا ہے۔ بھوٹان سے قربت کی بھی غالباً یہی وجہ ہے۔ شاید مذہب اور مشترک تاریخ غیر محسوس طریقے سے قوموں کے درمیان غیر مرئی رشتہ قائم کر دیتی ہے۔ مشترک مذہب اور مشترک تاریخ میری نظر میں مشترک زبان اور ثقافت جتنی ہی اہم چیزیں ہیں جو مختلف اقوام کے ایک دوسرے کے قریب لانے کا موجب بنتی ہیں۔

سری لنکا کی بدھ مت شناخت اور ورثے کے لحاظ سے یہ چیز قابل ذکر ہے کہ جیسا پہلے عرض کیا مہاتما بدھ کی تعلیمات کو کتابی شکل پہلی مرتبہ اسی جزیرے پر دی گئی تھی۔

یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ گوتم بدھ کے افکار و ارشادات کو ضبط تحریر میں پہلی مرتبہ اسی دیس میں لایا گیا تھا۔ یہ واقعہ انتہائی تاریخی اہمیت کا حامل اور طویل بھی ہے۔ مختصر طور پر بیان کروں تو حضرت عیسیٰ کی فلسطین میں پیدائش سے پچیس برس پیشتر اسی لنکا میں چوتھا عالمی بدھ مت اجلاس ہوا تھا، اسی اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ بدھا کے افکار کو ضبط تحریر میں لایا جائے گا۔ اس سے قبل مہاتما بدھ کی تعلیمات سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو بدھ بھکشو منتقل کرتے تھے۔ قدرتی آفات و وباؤں کے سبب بہت سارے جید بھکشوؤں کی پے در پے موت سے بدھ کی تعلیمات جنہیں ''پالی اصول'' کہا جاتا ہے، ناپید ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بار جب قحط سالی کے سبب بہت سارے نامور بدھ بھکشو دنیا سے رخصت ہوئے تو بچ جانے والے بھکشوؤں نے فنا کے خطرے کو بھانپتے ہوئے، انہیں درختوں کے پتوں، چھلکوں، اور جانوروں کے کھالوں کے علاوہ پتھروں پر کندہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

ابتدا میں یہاں ناریل کے پتے گوتم بدھ کی تعلیمات کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے کے لیے استعمال ہوئے۔ انہی پتوں پر تحریر کردہ سدھارتھ، جو بدھا بن گیا، کی تعلیمات تھائی لینڈ، برما، کمبوڈیا اور لاؤس پہنچی تھی۔ جہاں لوگوں نے ان افکار کو پسند کرتے ہوئے بدھ دھرم اختیار کرنا شروع کر دیا۔

سری لنکا کی چائے اس کی عالمی سطح پر شناخت کا حصہ ہونے کے علاوہ زرمبادلہ کا اہم ذریعہ بھی ہے۔ ملک کا نام سرکاری سطح پر تبدیل کر کے سیلون سے سری لنکا رکھنے کے باوجود چائے کی فروخت کے لیے پرانا نام سیلون ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ سیلون چائے کی پیداوار، اس کے باغات اور عالمی سطح پر اس کی مقبولیت برطانوی نوآبادیاتی عہد کی یادگاریں ہیں۔ اب بھی ملک کا سب سے مقبول چائے کا برانڈ ''سیلون انگلش ٹی'' ہے۔ حیرت انگیز طور پر یہاں برطانوی نوآبادیاتی عہد کو لوگ برا نہیں کہتے، بلکہ بے حد پسند کرتے ہیں۔ عمومی

طور پر اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ ملک میں کئی روزانہ اخبار انگریزی زبان میں چھپتے ہیں۔ مقامی آبادی کی سب سے بڑی زبان تو سنہالی اور پھر تامل ہے مگر سب سے کثیر الاشاعت اخبار انگریزی زبان میں چھپتا ہے۔

سری لنکا غیر وابستہ ممالک کی تنظیم کا رکن ہونے کے علاوہ، جنوبی ایشیاء کے ممالک کی تنظیم ''سارک'' اور دولت مشترکہ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سارک ممالک میں عمومی اشتراک تاج برطانیہ کی سوسالہ غلامی ہے، یہی وہ درد مشترک ہے جو ہمیں قریب لے آتا ہے۔ دولت مشترکہ بھی انگلستان کے زیر نگیں رہنے والے ممالک کے اجتماعی پلیٹ فارم سے زیادہ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ زراعت کا شعبہ، جس میں چائے اور مصالحہ جات کی برآمد نمایاں ہے، اور سیاحت وہ دوسرا ستون ہے جس پر ملک کی معاشی عمارت کھڑی ہے۔ اگرچہ صنعتی اور مالیاتی شعبہ جات میں بھی نمایاں ترقی دیکھی جا رہی ہے مگر معیشت کی ریڑھ کی ہڈی زراعت اور سیاحت کا شعبہ ہے۔

کولمبو اپنے محل وقوع اور موسم کے اعتبار سے کراچی سے ملتا جلتا ہے، آبادی نسبتاً کم ہے۔ یعنی ساٹھ لاکھ نفوس شہر کا پھیلاؤ کافی زیادہ ہے مگر بھیڑ کا عالم ویسا نہیں جیسے کراچی اور لاہور میں ہوتا ہے۔ شہر سے ایئر پورٹ آدھ گھنٹے کی مسافت پر ہے، اگر آٹو رکشہ لے لیں تو پھر بھی ایک گھنٹے میں باآسانی پہنچ جائیں گے۔
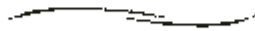
# قطر کی ایک جھلک

اسلامی فنونِ لطیفہ کے شاہکار پوری دنیا میں بکھرے پڑے ہیں۔ چودہ سو سال میں ارتقا پانے والے ان فنون کی ایک جھلک اگر آپ ایک ہی دن میں دیکھنا چاہیں، تو پھر اس کے لیے دنیا میں بس ایک ہی جگہ ہے اور وہ جگہ دوحہ، قطر میں واقع اسلامی آرٹ میوزیم، عجائب گھر کی پانچ منزلہ بے ستون عمارت جو کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے۔ بذاتِ خود فنِ تعمیر کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ بلامبالغہ یہ مشرقِ وسطیٰ کا سب سے بڑا اور معیاری عجائب گھر ہے۔ اگرچہ ایران، مصر اور عراق میں بڑے اچھے اچھے میوزیم موجود ہیں۔ مگر جس مذہبی نقطۂ نظر کے تحت یہ میوزیم قائم کیا گیا ہے اس کی اسلامی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال کی اسلامی تاریخ کے دوران تشکیل پانے والے تمام فنون کا خلاصہ ایک چھت کے نیچے قائم کر لینا یقیناً ایک بڑا مشکل، مہنگا اور قابلِ ستائش کام ہے۔ اس میوزیم کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ مکہ اور مدینہ میں بھی اس طرح کا اگر میوزیم بنا دیا جائے تو یہ بڑی نیکی اور بھلائی کا کام ہوگا۔

یہ جان کر شاید آپ بھی حیران ہوں گے کہ تازہ ترین مردم شماری کے مطابق قطر کی کل 26 لاکھ آبادی میں سے قطر کی شہریت کے حامل افراد کی تعداد محض تین لاکھ تیرہ ہزار ہے۔ اتنی مختصر سی آبادی، جو کہ میری آبائی تحصیل کی آبادی سے بھی نصف ہے۔ اس کے باوجود

دوحہ عالمی معیار کا ایک بڑا اور اہم شہر بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ قائم شہروں میں واکرہ مجھے بہت پسند آیا۔ قطر کی سرکاری اور نیم سرکاری عمارات کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہاں کے شاہی خاندان کو آرٹ کے شعبے سے خاص لگاؤ ہے۔ ورنہ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی کے بغیر ملک میں اس طرح کا فنکارانہ ماحول پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ متحدہ عرب امارات، سعودی عرب یا بحرین میں آپ کو دولت کی ریل پیل اور امارت کے جابجا مظاہر تو نظر آتے ہیں مگر فنونِ لطیفہ کا کوئی پہلو مشکل سے ہی وہاں ملتا ہے۔ مجھے اس پہلو سے قطر گلف کارپوریشن کے باقی پانچ ممالک سے ذرا مختلف لگا۔ شہر کے مرکز میں پھول کی پتیوں کا منظر پیش کرتی ہوئی ایک پر شکوہ زیرِ تعمیر عمارت کے متعلق میں نے استفسار کیا تو پتا چلا کہ کئی ایکڑ رقبے پر پھیلی اس عظیم الشان عمارت میں قطر نیشنل میوزیم قائم ہونے جا رہا ہے اور اس کا افتتاح بھی اسی سال ہوگا۔ یہ میوزیم بھی اسلامی فنونِ لطیفہ کے عجائب گھر سے بڑھ کر اگر نہیں تو اسی کی چوٹ کا ضرور ہے۔ غرض یہ ہے کہ میوزیم میں جس طرح تاریخی فن پارے ایک جگہ جمع کیے جاتے ہیں اس کے لیے بے تحاشا دولت تو درکار ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ محنت سے ان اشیاء کو جمع کیا جاتا ہے۔ بڑی لگن اور لگاؤ درکار ہوتا ہے۔ اس سب سے بڑھ کر ذوق چاہیے۔ فنونِ لطیفہ کے متعلق اعلیٰ ذوق سے ہی ایسے میوزیم تشکیل دیے جا سکتے ہیں۔ جزیرۃ العرب سے لے کر ترکی اور ایران تک سنٹرل ایشیا سے لے کر برصغیر پاک و ہند اور سپین تک پھیلی اسلامی عہد کی روایات اور اس دوران پروان چڑھنے والے فنون کو اکٹھا کرنا یقیناً بڑا کام ہے۔

قطر کی زمینی حدود فقط سعودی عرب کے ساتھ ملتی ہیں جبکہ سمندری حدود متحدہ عرب امارات اور بحرین کے علاوہ ایران کے ساتھ بھی ملتی ہیں۔ خلیج فارس میں واقع اس جزیرہ نما ملک کا رقبہ اور آبادی تو انتہائی مختصر ہے مگر یہاں اب تک کی دریافت کے مطابق دنیا میں گیس اور تیل کے تیسرے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ اسی سبب سے شاید یہاں امریکہ نے

مشرقِ وسطیٰ میں اپنا سب سے بڑا بحری اڈا قائم کیا ہے۔ الجزیرہ ٹی وی سے منسلک میرے میزبان راؤلیس ممتاز، جو خوبصورت لہجے کے شاعر اور جرات مند صحافی بھی ہیں ان کے بقول 1995 میں جب قطر کے موجودہ امیر نے اپنے والد کو معزول کر کے زمام اقتدار سنبھالی تو امریکہ بہادر نے فقط اس شرط پر نئی حکومت کو تسلیم کیا تھا کہ وہ قطر میں اسے بحری اڈا قائم کرنے کی اجازت دے گی۔ سچ پوچھیں تو قطر میں یہ اقتدار کی منتقلی انتہائی مثبت ثابت ہوئی۔ جوہری تبدیلیوں کا پیش خیمہ اس طرح بنی کہ ملک کا ناک نقشہ ہی بالکل بدل گیا۔ شیخ حماد بن خلیفہ کے دو عشروں پر محیط اس عہد میں معیشت نے انتہائی تیز اور خیرہ کن ترقی کی ہے۔ قطر کا عالمی سطح پر امیج ہی بالکل بدل گیا ہے۔ ملک میں جابجا فٹ بال عالمی کپ 2022 کی میزبانی کے لیے تیاریاں ابھی سے عروج پر نظر آتی ہیں۔ تعمیراتی کام زور وشور سے جاری ہیں جس کے سبب روزگار کے بے پناہ مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔ یاد رہے کہ قطر کئی برسوں سے مسلسل دنیا بھر میں فی کس آمدنی کے اعتبار سے امیر ترین ملک ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ ملک کی کرنسی ریال ہے، جو ہمارے تیس روپے میں ایک آتا ہے۔ ملک میں تعلیم بالکل مفت ہے اور کسی قسم کا کوئی ٹیکس بھی نہیں ہے۔ ٹیکس فری ریاست ہونے کا اعزاز آج کی دنیا میں معجزہ ہے۔ صحت کی تمام سہولیات بھی یہاں اپنے شہریوں کو مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

عربوں کے متعلق میرا عمومی تاثر یہی ہے کہ مغرور اور بدتمیز ہوتے ہیں۔ مگر یہاں آ کر محسوس ہوا کہ مجھے اپنی رائے پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ اس سفر کے دوران قطر کی سرزمین کا یہ منشور اور نظریہ سامنے آیا کہ مسافر کبھی اجنبی اور پرایا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ایسا دوست ہوتا ہے جس سے آپ کی ملاقات ہونا ابھی باقی ہے جو دوست پہلے کبھی آپ سے نہیں ملتا ہے اس نظریے کی عملی صورت میں ایک جھلک قومی ایئر لائن پیش کرتی ہے۔ قطر ایئر لائن کو قطری حکومت باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ملک میں سیاحت کے فروغ کے لیے بڑی

کامیابی کے ساتھ ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اچھی سروس، کم دام ٹکٹ، وسیع و عریض اور پرتعیش سستا ایئرپورٹ اور امیگریشن کا دوستانہ اور آسان مرحلہ مل جل کر سیاحت کے فروغ میں غیر مرئی طور پر اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ملکی ایئر لائن کو سیاحت کے فروغ کے لیے استعمال کرنے کی دو دیگر کامیاب مثالیں تھائی لینڈ کی تھائی ایئر ویز اور متحدہ عرب امارات کی ایمرٹس اور اتحاد ایئر لائن ہیں۔

شائقین فن دوحہ اور مجلس فروغ اُردو کی ایوارڈ ز تقریب میں راجو جمیل عالی بتا رہے تھے کہ دو دہائیاں قبل قطر بوریت سے بھرپور دیس تھا۔ مگر آج دیکھیں تو یہاں ایسی رنگا رنگی اور رونق میلہ ہے کہ تیزی سے یہ پورے عالم کے لیے ایک تفریحی مقام کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ قطر کا میرا یہ دورہ مجلس فروغ اُردو اور اس سے منسلک شائقین فن دوحہ کی دعوت پر تھا۔ دو روزہ تقریبات میں ایوارڈ ز اور مشاعرے کا فقید المثال اہتمام تھا، پاکستانی اور اردو بولنے والی ہندوستانی کمیونٹی نے کثیر تعداد میں اس میں شرکت کی۔ میں بوجوہ دوسرے دن کی تقریب میں شریک نہ ہو سکا مگر یہ تفصیلات پھر کبھی بیان کروں گا۔ مذکورہ تنظیمیں اردو زبان اور پاکستان کے سافٹ امیج کے لیے بہت زیادہ اور قابل ستائش کام کر رہی ہیں۔

قطر کی تاریخ بیان کروں تو یہ جزیرہ نما برطانوی اس سے پہلے سلطنتِ عثمانیہ اور پرتگالی قبضے میں رہا۔ مزید پیچھے جائیں تو بدو قبائل یہاں حکمرانی کرتے تھے۔ 1777 میں یہ دیس ایران کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اسی دوران بحرین کے ساتھ اس کی طویل جنگ کا آغاز ہو گیا۔ قطر اور بحرین کی جنگ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے برطانیہ نے اس ملک پر قبضہ کر لیا جو کہ 1971ء تک قائم رہا۔ اسی عہد کی وجہ سے ملک کی سرکاری زبان عربی کے علاوہ انگریزی بھی ہے۔ رسمی آزادی حاصل کرنے سے پہلے بھی موجودہ حکمران خاندان ہی قطر پر حکومت کر رہا تھا۔ اس شاہی خاندان نے انیسویں صدی میں اقتدار حاصل کیا تھا۔ انگریز کے ساتھ ان

کے تعلقات بڑے خوشگوار رہے ہیں۔یہی وہ تاریخی پس منظر ہے جس کے سبب مشرق وسطیٰ بلکہ اسلامی دنیا کا سب سے موثر انگریزی وعربی چینل الجزیرہ اس ملک میں قائم ہوا تھا۔ ابتدا میں الجزیرہ کو اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے رہنماؤں سے کیے گئے انٹرویوز نشر کرنے پر شہرت ملی تھی۔ الجزیرہ سے منسلک میرے میزبان دوست نے بتایا کہ اس ادارے میں حکومتی یا ادارتی مداخلت نہ ہونے کے برابر ہے۔میرے لیے یہ بات خوشگوار حیرت کا سبب ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابل یقین سی لگتی تھی مگر ایک تقریب میں الجزیرہ ٹی وی کے ساتھ دس سال تک منسلک رہنے والے پاکستانی نژاد صحافی سے ملاقات ہوئی تو اس نے تصدیق کی کہ ٹی وی کا ماحول عالمی معیار کے نشریاتی اداروں جیسا آزادانہ اور خودمختارانہ ہے۔سنسر شپ بہت ہی محدود نوعیت کی ہے۔

اونٹوں کی دوڑ عربوں کی قدیم روایت ہے۔ اس روایت میں ایک سفاک پہلو اس طرح داخل ہوا کہ اونٹ کی کمر پر نوعمر بچوں کو باندھ دیا جاتا تھا۔ جب دوڑ میں شامل اونٹ دوڑنے لگتا تو یہ بچے رونا شروع کر دیتے تھے۔بچوں کی چیخ وپکار سن کر یہ اونٹ اور تیز دوڑنا شروع کر دیتے، جیسے جیسے بچوں کی آہ وبکا تیز تر ہوتی، ویسے ویسے ہی اس شور کو سن کر اونٹ گھبرا کر اور تیز دوڑنے لگتے۔ اس دوڑ کے خاتمے پر بہت سے بچے ہلاک اور کچھ ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو جایا کرتے تھے۔ یہ بچے پاکستان جیسے غریب ممالک سے اغوا کر کے لائے جاتے تھے اور ان معصوموں کو بردہ فروش چند ٹکوں کی خاطر اونٹ دوڑ کے شوقین ان عربوں کو بیچ دیا کرتے تھے۔لق ودق صحرا میں ہونے والی اس اونٹ دوڑ میں شامل بچوں کے استعمال پر قطر کی حکومت نے پابندی عائد کر دی ہے۔ اور ان کی جگہ ریموٹ کنٹرول شتربان استعمال کیے جارہے ہیں۔ انسانی ہمدردی کی یہ مثال مجھے بہت اچھی لگی جو کہ دیگر عرب ممالک کے لیے بھی قابل تقلید ہے۔
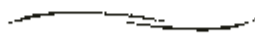
# ارجنٹائن۔خوابوں جیسی حسین سرزمین

بیونس آئرس ایئر پورٹ پر جہاز لینڈ ہوتے ہی بیشتر مسافروں نے تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ دنیا کے دیگر خطوں کے مقابلے میں لاطینی امریکہ کے باسی زیادہ جذباتی اور جذبات کے اظہار میں ذرا زیادہ دلیر اور آزاد واقع ہوئے ہیں۔ ساڑھے چار کروڑ نفوس پر مشتمل ارجنٹائن کا یہ سب سے بڑا شہر ہے اور اس ملک کا دارالحکومت بھی ہے۔ ہمارے اسلام آباد اور انڈیا کے دہلی کی طرح بیونس آئرس بھی ایک خودمختار علاقہ ہے اور کسی صوبے کا حصہ نہیں ہے۔ گو کہ ارجنٹائن کے 23 صوبے ہیں، جن کا مجموعی رقبہ اس ملک کو دنیا کی رقبے کے اعتبار سے آٹھویں بڑی مملکت بناتا ہے۔ علاوہ ازیں رقبے کے لحاظ سے یہ ہسپانوی بولنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔

ارجنٹائن پہنچ کر پہلی خوشگوار حیرت اس وقت ہوئی جب ہوٹل کے استقبالیہ پر کھڑے نوجوان لڑکے نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہی کہا کہ آپ کی بیٹا شفیع مجھے بے حد پسند

ہے، کیا خوبصورت آواز میں گاتی ہے۔ حیرت کا پہلو یہ ہے کہ اس نوجوان کو سوائے ہسپانوی کے کوئی دوسری زبان نہیں آتی، اردو تو بالکل بھی نہیں۔ مگر موسیقی تو ایک عالمی زبان ہے، بول سمجھ میں نہ بھی آسکیں پھر بھی آپ لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سات سمندر پار بیٹھا یہ شخص پاکستان کے کوک سٹوڈیو میں ریکارڈ ہونے والے سیزن 9 تک ہماری موسیقی پر کان جمائے بیٹھا ہے۔ فن سے یہ لوگ پیار کرتے ہیں ۔اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو ان لوگوں نے بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں تھیٹر میں نے دنیا کے کسی اور دیس میں نہیں دیکھے۔ حالانکہ داخلے کی سب سے سستی ٹکٹ بھی پاکستانی سات ہزار روپے کی ہے، جبکہ مہنگی تو کافی زیادہ مہنگی ہے۔ شہر کے وسط میں حکومت کا قائم کردہ تھیٹر میوزیم بھی قابلِ دید ہے۔ اس میں تھیٹر کی روایت اور تاریخ کا احاطہ کرنے کے علاوہ عہد ساز ڈراموں کی تصاویر اور ملبوسات سجائے گئے ہیں۔ یہ میوزیم ایک قدیم و معروف تھیٹر کی عمارت میں قائم کیا گیا ہے۔ شہر میں دن بھر کسی نہ کسی چوک اور چوراہے ہیں ''ٹانگو'' رقص ہوتا رہتا ہے، جو کہ ارجنٹائن کی ثقافتی پہچان ہے۔ بن سنور کر لڑکے لڑکیاں اس میں شریک ہوتے ہیں، بہت سارے ان میں سے پروفیشنل اور نیم پروفیشنل بھی ہوتے ہیں، مجمع اکٹھا کر کے یہ ٹانگو رقص پیش کرنے کے بعد اپنی موسیقی کی بنائی ہوئی سی ڈی فروخت کرتے ہیں۔ اس کی قیمت عموماً کافی یا چائے کے ایک کپ کے برابر ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جیسے مداری اور مجمع باز تماشہ دکھا کر پہلے مجمع اکٹھا کرتے ہیں اور آخر میں کوئی دوائی بیچتے ہیں۔ شاید یہی رنگا رنگی ہی وجہ ہے کہ بیونس آئرس جنوبی امریکہ میں سیاحوں کی مقبول ترین منزل اور سب سے زیادہ سیاحتی آمدورفت والا شہر قرار دیا جاتا ہے۔ اس شہر میں امن وامان کی صورت حال مثالی ہے اور پھر سمندر کے ساحل نے تو اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

مقامی کرنسی پیسو ہے ایک پیسو ہمارے سات روپے کے برابر ہے۔ دلچسپ بات

یہ ہے کہ سالہا سال تک ارجنٹائن نے ڈالر اور پیسو کو آپس میں یوں نتھی کیا ہوا تھا کہ ایک پیسو، ایک امریکی ڈالر کے برابر تھا۔ مگر چونکہ یہ تعلق مصنوعی طریقے سے جوڑا گیا تھا، اس فیصلے کی معاشی بنیادیں کمزور تھیں۔ لہذا یہ تعلق جب ٹوٹا تو اس کے انجام کے طور پر ارجنٹائن کو بہت خوفناک معاشی بحران سے گزرنا پڑا۔ پیسو کو آزاد کرنسی قرار دے دیا گیا، بعد از خرابی بسیار، آجکل ایک ڈالر میں پندرہ پیسو آجاتے ہیں۔ ارجنٹائن کی معیشت کو اگر تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو صرف ایک صدی پہلے یہ دنیا کا سا تواں امیر ترین ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس کی معاشی ترقی ہی وہ وجہ تھی کہ یہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک یورپ سے ہجرت کرنے والے تارکین وطن کی امریکہ کے بعد سب سے مقبول منزل تھا۔ یہ تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ اس ملک کی ستر (70%) فیصد آبادی ہسپانوی اور اطالوی نسل کے لوگوں کی ہے باقی ماندہ لوگ یورپ کے دیگر ممالک یا پھر دنیا کے باقی ملکوں سے آئے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ امریکہ اور آسٹریلیا و کینیڈا کی طرح تارکین وطن کا ملک ہے۔ معیشت میں گراوٹ کے باوجود یہ معاشی اعتبار سے پہلے بیس، دنیا کی مضبوط ترین معیشت رکھنے والے ممالک میں سے ایک ہے۔

برف پوش اور سر سبز پہاڑوں، ہری بھری چراگاہوں اور میدانوں کے اس دیس کی مرغوب غذا گوشت ہے۔ یہاں اعلیٰ قسم کا تازہ گوشت ارزاں نرخوں پر دستیاب ہے اور یہ گوشت اس ملک کی برآمدات کا اہم جزو بھی ہے۔ بھنا ہوا گوشت یہاں کی زندگی اور دسترخوان کا لازمی جزو ہے۔ تازہ سبزیاں، پھل اور دودھ کے علاوہ گوشت مرغوب و مقبول غذا ہے، اسی سبب سے لوگ بہت صحت مند ہیں۔ کھانے، پینے کے شوقین لوگ بہت ہیں مگر موٹاپا نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ عوام کی کھیلوں کے ساتھ رغبت ہے۔ یوں تو کبڈی سے لیکر ہاکی، ٹینس، گالف، سبھی کچھ یہاں اعلیٰ معیار کا کھیلا جاتا ہے مگر فٹبال کی مقبولیت کا احوال تو

بیان کرنا مشکل ہے۔ایک پورے اسٹیڈیم کو جو شہر کے وسط میں تھا، فٹبال کے عجائب گھر میں بدل دیا گیا ہے۔داخلے کی ٹکٹ پانچ صد روپے ادا کر کے اندر جائیں تو دیکھیں گے کہ ارجنٹائن کے فٹ بال کی پوری تاریخ یہاں محفوظ ہے۔سینما اسکرینیں لگی ہوئی ہیں، جن پر ہر وقت فٹ بال کے یادگار لمحوں کی فلمیں چلتی رہتی ہیں۔میراڈونا کا گول یا اب بھی نہیں بھولے جس نے انہیں دہائیاں قبل فٹ بال کا عالمی چیمپئن بنایا تھا۔فٹبال میوزیم کے اردگرد ریستوران اور دوکانیں بھی فٹبال کے دیوانوں اور پروانوں کی ہیں۔ایک ایسے ہی ریستوران میں لنچ کیلئے داخل ہوا تو پتا چلا کہ یہاں مشہور کلب کولوکولو کا قبضہ ہے۔جان کی امان چاہتے ہیں تو ان مردوزن کے سامنے کولوکولو کے متعلق کوئی تنقیدی جملہ زبان پر مت لائیں بے حد جذباتی فضا اور مزید ارکھانا۔

ارجنٹائن کے سماج کا طائرانہ جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کی سب سے مقبول شخصیات تین ہیں، جو کہ معروف فٹ بالر میراڈونا، بائیں بازو کے انقلابی گوریلا چے گویرا اور پاپائے روم فرانسس ہیں، ان تینوں کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ویسے تو ہالینڈ کی موجودہ ملکہ معظمہ میکسیما بھی ارجنٹائن میں پیدا ہوکر یہی پلی بڑھی ہیں مگر ان کی مقبولیت مذکورہ شخصیات جیسی نہیں ہے۔پوپ فرانسس کی عالمی اہمیت تو اس وجہ سے بھی ہے چونکہ وہ پہلے غیر یورپی ہیں جو ویٹی کن میں اس بلندترین عہدے تک پہنچے ہیں، کیتھولک کلیسا کے سربراہ کی اہمیت بالخصوص لاطینی امریکہ میں کچھ زیادہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کیتھولک یہاں پائے جاتے ہیں۔ہر ملک میں ان کا تناسب اسی فیصد (80%) کے قریب ہے۔یوں تو ایونجلیکل عیسائی مسلک شمالی وجنوبی براعظم امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا عقیدہ ہے۔مگر ابھی تک کسی بھی ملک میں اس کے پیروکار دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں، ارجنٹائن میں ان کا تناسب نو فیصد ہے اور گیارہ فیصد لوگ لادین ہیں۔

مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ یہاں بسنے والے یہودیوں کے برابر ہے یا پھر ان سے تھوڑے زیادہ ہیں۔شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان مسجد ہے جس سے ملحقہ ایک لائبریری اور اسلامک سنٹر بھی ہے۔اس کا انتظام عرب مسلمان چلاتے ہیں۔عالیشان مسجد کی ویرانی دیکھ کر اقبال کا وہ شعر یاد آتا ہے۔

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

لاطینی امریکہ میں سب سے زیادہ یہودی اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ دارالحکومت میں جگہ جگہ آپ کو مخصوص ٹوپی "سکل کیپ" سیاہ کوٹ پتلون اور سفید قمیض میں ملبوس یہودی نظر آتے ہیں۔شہر کے وسط میں ایک بڑا اور قدیم "سینیگاگ" ہے۔اس معبد سے ملحقہ ایک یہودی میوزیم ہے۔میں نے اس میوزیم میں داخل ہونے کی بہت کوشش کی مگر مسلمان اور پاکستانی شناخت ہونے کے سبب مجھے داخلے کی اجازت نہیں دی گئی۔البتہ میری درخواست پر غور جاری ہے، انتظامیہ کا کہنا ہے کہ آپ کو ای میل کے ذریعے مطلع کر دیا جائے گا،صاف انکار انہوں نے ابھی نہیں کیا ہے۔

بیونس آئرس کے مرکز میں تمام عمارتیں کثیر المنزلہ ہیں۔طرز تعمیر کے اعتبار سے تو یہ یورپ کا کوئی شہر معلوم ہوتا ہے، ہسپانوی اور اطالوی طرز تعمیر نمایاں ہے۔ہسپانوی طرز تعمیر کی وجہ بھی قابل فہم ہے کہ یہ ملک صدیوں تک سپین کی نوآبادی رہا ہے اور 1810 میں اس نے آزادی حاصل کی ہے۔لاطینی امریکہ میں ارجنٹائن ہسپانوی نوآبادیاتی سلطنت کی اسی طرح وارث ریاست ہے جس طرح سوویت یونین کی وارث روس کی ریاست ہے۔چونکہ لاطینی امریکہ میں ہسپانوی سلطنت کا صدر مقام یہیں تھا۔گنجان آباد اور جدید شہر ہونے کے باوجود بیونس آئرس میں ٹوکیو، نیویارک یا لندن جیسی بے چینی اور دوڑ دھوپ نظر نہیں آتی

بلکہ ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور موسیقیت یہاں کا خاصہ ہے۔جگہ جگہ رقص وموسیقی کا دور دورہ ہے۔لوگوں کا عمومی معیار زندگی کافی بہتر ہے۔ساحل سمندر کے ساتھ بنی سڑک پر وقفے وقفے سے ملک کے اہم کھلاڑیوں کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں۔فٹ بال ٹینس، ہاکی، باکسنگ سے لے کر جمناسٹک اور دیگر کھیلوں میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے موجودہ اور سابق کھلاڑیوں کے مجسمے عوامی مقامات پر نصب کرنا ان کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک قابل تقلید طریقہ ہے۔ساحل کے ساتھ اسی سڑک پر خواتین کے لئے مخصوص ایک ٹینس کلب کا نام پڑھ کر میں دیر تک اکیلا ہی ہنستا چلا گیا۔

آپ بھی سنیے کیا تخلیقی نام ہے ''ڈارلنگ ٹینس کلب''یقیناً آپ کو بھی زنانہ ٹینس کلب کی تانیث بیان کرنے کے لیے یہ طریقہ پسند آئے گا۔آپ کسی بھی وقت گھر سے نکلیں ،ہر وقت تازہ دم ہواؤں کے جھونکے آپ سے ٹکرانے لگتے ہیں،مگر یہ ہوائیں ''صرصر''نہیں بلکہ ''صبا'' کی سی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ان ہواؤں سے متاثر ہوکر ہی اس شہر کا نام بیونس آئرس رکھا گیا یعنی ''خوش کن ہوائیں'' یا پھر ہسپانوی زبان سے اس کا ترجمہ ''بادخوش گوار'' بھی کیا جا سکتا ہے۔سپین سے آنے والا وہ مہم جو یقیناً بہت باذوق ہوگا جس نے نیا شہر بسا کر پانچ صدیاں پہلے اس کو مدھر ہواؤں سے منسوب کر دیا۔ان ''اچھی ہواؤں'' کا ہی فیض ہے کہ گنجان آباد اور کثیر المنزلہ ہونے کے باوجود دنیا کے دیگر میٹروپولیٹن شہروں کی طرح یہ کنکریٹ اور اسفالٹ کا جنگل نہیں لگتا بلکہ زندہ دلوں کا شہر معلوم پڑتا ہے۔

ارجنٹائن میں سڑکوں اور چوراہوں کے نام عموماً دوست ممالک اور ان کے شہروں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ملک کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ایام سے بھی شاہراہوں کو منسوب کیا گیا ہے،جیسے 9 جولائی نام کی سڑک تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ویسے یہ چلن ارجنٹائن تک ہی محدود نہیں بلکہ لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک میں یہ

رواج پایا جاتا ہے کہ گلی، کوچے، سڑکیں اہم شخصیات کے علاوہ اہم دنوں، دوست ممالک اور ان کے شہروں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ آپ کو شاید حیرت ہو کہ یہاں ''پاکستان چوک'' بھی ہے۔ سڑکوں کے کناروں پر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اور گلیوں، بازاروں میں گھومتے پھرتے خواتین کی اتنی بڑی تعداد سگریٹ نوشی کرتے میں نے اسی عالم رنگ و بو میں اور کہیں نہیں دیکھی، جتنی کثیر تعداد اس دیس میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میرا مطلب ہے عوامی مقامات پر، اور وہ بھی آزادانہ چلتے چلتے مرد و زن کی کثیر تعداد تمباکو نوشی میں محو نظر آتی ہے۔ اٹھائیس لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل یہ جنت نظیر ملک فقط رقبے کے اعتبار سے دنیا کا آٹھواں بڑا ملک نہیں ہے بلکہ اپنے حسن اور ثقافت کی بنیاد پر دنیا کا آٹھواں بڑا عجوبہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں کا معیاری وقت پاکستان سے آٹھ گھنٹے پیچھے ہے مگر جب یہاں پہنچیں تو لگتا ہے یہ دنیا ہی کوئی مختلف ہے۔ صرف یہاں کا موسم ہی ہم سے متضاد نہیں، یعنی دسمبر میں گرمی اور جون سخت سردی کا مہینہ ہے، بلکہ ہمارے انداز زیست اور ان کے زندگی گزارنے کے ڈھنگ میں بھی کھلا تضاد ہے۔
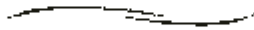
# پیرو کا تلکنا

تین کروڑ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے دنیا کا انیسواں بڑا ملک پیرو براعظم شمالی وجنوبی امریکہ کا قدیم ترین تہذیبی مرکز ہے۔ یہ دیس انسانی تاریخ کے قدیم ترین تمدن ''ان کا'' دارالحکومت تھا اور ''ان کا'' سلطنت جو تقریباً پورے جنوبی امریکہ پر حکومت کرتی تھی، اس کا سربراہ اسی ملک کے شہر ''ماچوپیچو'' میں اپنا دربار لگاتا تھا۔ میسوپوٹیمیا، بابل ونینوا کو بھی دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر وہاں مرکزی حکومت ایسی مضبوط نہیں تھی جیسی ''ان کا'' تہذیب میں تھی۔ اس کے علاوہ جس قدر پھیلی ہوئی یہ سلطنت تھی، ویسی میسوپوٹیمیا، بابل ونینوا میں یقیناً نہ تھی۔ جدید پیرو کی تاریخ دو صدیاں پہلے ہسپانوی سلطنت سے آزادی حاصل کرنے کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ تین صدیوں پر محیط اس سرزمین کے نوآبادیاتی عہد کی یادگار ملک کی قومی زبان ہسپانوی ہے۔ ''آمارا'' اور ''کیچوا'' بھی قبائلی علاقے میں رائج مقبول زبانیں ہیں۔ مگر سرکاری زبان

سپینش ہے۔اگر تہذیبی ارتقاء کی بات کی جائے تو میری نظر میں وادی سندھ کی تہذیب ،جس کے مراکز ہڑپہ اور موہنجوداڑو تھے۔اپنے وقت میں دنیا کی تمام تہذیبوں سے جدید تر تھی۔

''ان کا'' تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیب ضرور قرار دیا جاتا ہے چونکہ ''انڈس تہذیب'' چار سے پانچ ہزار سال پرانی ہے جبکہ ''ان کا'' سات ہزار سال پرانی ہے اور میسوپوٹیمیا بھی ،مگر ماچو پیچو کے آثار دیکھیں تو یہاں پتھر کے زمانے کا گمان ہوتا ہے، سب کچھ پتھروں کو تراش خراش کے بنایا گیا ہے۔ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں تو سب کچھ پختہ اینٹوں سے بنایا گیا ہے،حیرت انگیز طور پر ان اینٹوں کا سائز وہی ہے جو آج بھی دنیا میں معیاری و مستعمل سائز تسلیم کیا جاتا ہے۔آثار میں ملنے والے ظروف مٹی سے بنائے گئے ہیں ۔کھیتی باڑی کے جو آلات ملے ہیں وہ جدید دور کے لگتے ہیں۔چند سال پہلے میں نے نامور ادیب ،دانشور اور صحافی منو بھائی کے ساتھ ہڑپہ کے تاریخی آثار کا دورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیب جسے ''انڈس سویلائزیشن'' اور سندھ ساگر کی تہذیب کہا جاتا ہے،ایک سوشلسٹ سماج تھا ،یہاں کھانا مفت ملتا تھا،کھدائی میں کہیں بھی جنگ کے آلات نہیں ملے ہیں ،حالانکہ کھیتی باڑی کے بہت سے آلات ملے ہیں۔خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سماج شاید کسی وبائی مرض کا شکار ہوگیا تھا۔یا پھر کسی دوسری قدرتی آفت کا شکار ہوگیا ہوگا۔

پیرو کا تذکرہ کریں تو ایمازون کے جنگل اور دریا کا ذکر در آتا ہے،یا پھر آندلیس کے پہاڑوں ،ماچو پیچو کی چوٹیوں ،ان کا سلطنت اور ہسپانوی نوآبادیاتی عہد اور اس کے اثرات کا ذکر ،مگر میں یہاں ایک چھوٹے سے شہر کی بات کرنا چاہتا ہوں۔جس کی پاکستانیوں کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے،جنوبی امریکہ کے ملک چلی کی سرحد پر واقع اس

شہر کا نام تکنا ہے۔

جی ہاں! تکنا شہر کا نام بھی ہوسکتا ہے، اگر آپ تکنا کا مطلب شوق سے دیکھنا سمجھے ہیں تو پھر آپ کا اندازہ غلط ہے۔ اس وقت میری مراد پیرو کے جنوب میں واقع اس ملک کے دسویں بڑے شہر سے ہے۔ یہ واقعی قابل دید ہے۔ لہٰذا اگر آپ کا اندازہ نگاہِ شوق تھا تو پھر بھی کچھ زیادہ غلط نہیں تھا، کیونکہ تکنا کو ان معنوں میں بھی لیا جاسکتا ہے۔
چلی کے آخری شہر سے فقط بیس میل کی دوری پر واقع تکنا اور اریکا شہر کی مثال راولپنڈی اور اسلام آباد جیسی ہے۔

آج کل یہاں آباد پاکستانیوں کی تعداد محض دس، پندرہ افراد تک محدود ہوگئی ہے۔ مگر کسی زمانے میں یہ دو، تین سو کے قریب ہوتے تھے۔ ان سب کا تعلق جاپانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے تھا۔ اس کے علاوہ بھی چند کاروباروں میں یہ لوگ شریک رہے ہیں۔ مگر زیادہ افراد اب بھی گاڑیوں کے کاروبار سے متعلق ہیں۔ پرانی گاڑیوں کی درآمد پر پابندی کی وجہ سے زیادہ تر پاکستانی اس ننھے سے شہر سے ہجرت کر گئے ہیں۔ شہر میں ایک عالیشان آباد مسجد ہے جو پاکستانیوں نے تعمیر کی ہے۔ نمازِ پنجگانہ کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی یہاں باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ اس پرشکوہ مسجد کو دیکھنے کے لئے سیاح دور دور سے کھنچے چلے آتے ہیں۔

پورے ملک میں یہ شہر اپنے جذبہ حب الوطنی کے سبب مشہور ہے، 1820 سے شروع ہونے والی جنگ آزادی جس کے سبب 1824 میں ملک کو آزادی ملی۔ اور پھر چلی کے ساتھ 1888 میں جنگ بحرالکاہل میں اس شہر نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ پیرو کی آزادی کی تحریک کا آغاز اسی شہر سے 1811 میں ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں ملک وجود میں آیا۔ اسی شہر کو پیرو اور بولیویا کی مشترکہ ریاست کے دارالخلافہ رہنے کا

بھی اعزاز حاصل رہا ہے۔ گو کہ یہ یہ اشترا کی ریاست فقط چار سال ہی قائم رہ سکی تھی۔

اس شہر کی تاریخ میں ایک دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب جنگ بحرالکاہل میں چلی نے یہ شہر فتح کرلیا اور اگلے پچاس سال تک یہاں پر اسکی حکومت رہی۔ 1930 میں ایک معاہدے کے تحت یہ شہر پیرو کو واپس مل گیا۔ مگر اگلے دو شہر جو چلی کے ابھی قبضے میں تھے، ان پر اپنا حق حاکمیت منوالیا۔ حالانکہ وہ پیرو کا صدیوں سے حصہ چلے آرہے تھے۔ گزشتہ صدی کی ابتدا میں یہ شہر اٹلی سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی مقبول و معروف منزل رہا۔ جنگ اور اس کے بعد کے حالات نے اس میں کافی تبدیلی پیدا کردی۔ مگر اب بھی شہر کی آبادی میں آپ کو اطالوی خاندانی نام کثرت سے ملیں گے۔

شہر کے عین وسط میں ایک قدیم کیتھولک کلیسا ہے۔ یہ چوک شہر کا مرکزی نقطہ بھی ہے اور سماجی گہما گہمی کا مرکز بھی، ایک شام اس چرچ کی خصوصی عبادت کے بعد ایک قطار میں کھڑے لوگ باری باری پادری سے سلام لے رہے تھے۔ سیاحتی نقطہ نظر سے میں پہلے کلیسا میں اس پادری کا خطاب بھی سن چکا تھا اور اب ثقافتی آداب بجالاتے ہوئے لوگوں کے ساتھ قطار میں بھی کھڑا ہوگیا تھا۔ میری باری آئی تو پادری نے میرے ساتھ سلام لیتے ہوئے بایاں ہاتھ بلند کر کے اس کا مکا بنایا اور اللہ اکبر کا نعرہ لگادیا۔ اس نعرے کو سن کر سبھی لوگ مسکرانے لگے۔

کبھی یہاں ٹیکس فری زون قائم تھا جہاں دنیا بھر سے سرمایہ کار آتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب یہاں پاکستانیوں کا طوطی بولتا تھا۔ نوے فیصد پاکستانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک تھے اور انتہائی مالدار تھے۔ مگر کاروباری ناموافق حالات کے سبب اب فقط چند ہی لوگ باقی بچے ہیں۔

تکنا سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ساحلی شہر ایلو ہے جس کا نام سن کر ماضی کا مقبول

بھارتی گانا ’’ILU ILU‘‘ یاد آتا ہے۔ وہاں ایک دوست نے اپنے ویزے کی مدت میں توسیع کے لیے درخواست بمع رشوت جمع کروا رکھی تھی۔ خیر ہم دستاویزات وصول کرنے کے لیے گئے تو دن دیہاڑے دفتر میں شراب کا دور دورہ چل رہا تھا۔ پہلے تو مجھے جھٹکا لگا کہ میرے دوست کو شاید ایڈریس کی بابت کچھ غلطی لگ گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا، وہ واقعی امیگریشن کا دفتر تھا۔ میں نے اس ماحول اور موسیقی کے ساتھ رقص وغیرہ کا سبب پوچھا تو پتا چلا کہ آج ایک دفتری کارکن کی سالگرہ ہے۔ اس لیے تھوڑا بہت جشن چل رہا ہے۔ سب سے بڑے افسر نے ہاتھ میں بڑی بوتل پکڑ رکھی تھی۔ ہمیں بھی اس نے شراب پینے کی دعوت دی۔ میرے دوست نے بہانہ کر دیا کہ اس نے گاڑی ڈرائیو کرنی ہے۔ اس لیے نہیں پی سکتا، جب میں نے بھی انکار کیا تو مذکورہ افسر طنزیہ کہنے لگا کہ کیا آپ دونوں نے ہی گاڑی چلانی ہے؟ انہوں نے مذاق ضرور کیا مگر پینے پر اس سے زیادہ اصرار نہیں کیا، اور ہمارا کام بھی ہوگیا۔ کیونکہ پورا دفتر ہی آج فیاضی پر آمادہ تھا اور سخاوت سے کام لے رہا تھا۔

اپنی نصف زندگی عالم کفر میں گزاری لیکن صرف ایک بار شراب پینے کے لیے اصرار کا سامنا کرنا پڑا، جنوبی افریقہ کے جہاز میں اکانومی کلاس کی تین نشستوں والی سیٹ پر میرے برابر دو خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ معانقے کے بعد رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور پھر انہوں نے شیمپین کی بوتل نکال لی، وجہ بظاہر ان دونوں میں سے ایک کی سالگرہ تھی، ایک دھما کے سے بوتل کھولی گئی اور جھاگ کے ساتھ کچھ ام الخبائث بھی چھلک پڑی۔ ان دونوں نے مجھے پینے کی دعوت دی اور انکار پر قائل کرنے کی کوشش میں لگ گئیں کہ دیکھو آج تم نے انکار کیا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں نے اسے میڈیکل سے لیکر مذہب تک بہانہ کیا۔ اسے سمجھایا کہ شراب میرے مذہب میں حرام ہے۔ مگر برابر والی نشست پر براجمان فربہ گوری خاتون تو ڈٹی رہی، کہنے لگی مگر یہ تو شیمپین ہے۔ بھلا اس کا کیا گناہ ہوگا؟ اسے سمجھایا

بی بی ایک قطرہ بھی پیا گناہ ہے۔تو اس سالگرہ والی خاتون نے التجا اور شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا کہ میری آج سالگرہ ہے، میری خاطر تم اتنا سا بھی گناہ سہار نہیں سکتے؟ خیر اسی بحث وتکرار میں کیپ ٹاؤن آ گیا۔مگر اس کے علاوہ زندگی میں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی کسی نے اس قدر اصرار کیا ہو۔

میں تکنا کا ذکر کر رہا تھا کہ جن دنوں یہ شہر پاکستانیوں سے آباد ہوا کرتا تھا تو ہر چوتھے دن کسی نہ کسی کے گھر دعوت ہوتی تھی، جسے عرف عام میں یہاں ''فیستا'' کہتے ہیں انگریزی کا لفظ ''FEAST'' اس کا مناسب متبادل ہے۔بہت خوبصورت ماحول تھا، میرے لیے تو یہ ناسٹلجیا ہی ہے مگر اس شہر کی تاریخ کا ایک خوبصورت باب بھی ہے، جب یہاں پر ایک دہائی سے زیادہ عرصہ تک پاکستانی کمیونٹی کے افراد شہر کی معیشت میں بہت اہم، اور ہر محفل کی رونق ہوا کرتے تھے۔جیسا کہ عرض کیا یہ سب لوگ مالی طور پر انتہائی آسودہ حال تھے۔شہر کے مہنگے ترین مکانوں میں رہائش پذیر تھے، مہنگی گاڑیاں ایک دوسرے سے مقابلے اور ضد میں رکھتے تھے۔خود بھی تقریباً تمام لوگ گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک تھے۔ریستوران، شاپنگ سنٹر اور شب کدوں میں جانِ محفل ہوتے تھے۔

شہر سے دس کلومیٹر دوری پر حکومت نے ایک ٹیکس فری زون ''سی کوس'' کے نام سے قائم کر رکھا تھا، یہاں پر انہی پاکستانیوں کا راج تھے، جو تعداد میں ہمیشہ دو تین سو کے قریب ہی تھے مگر سبھی کاروباری حضرات تھے۔گو کہ شہر میں دو پاکستانی ریستوران تھے، مگر زیادہ تر گھروں میں دیسی کھانے بنانے میں خصوصی مہارت رکھنے والی خواتین کام کرتی تھیں۔دور دراز کے گاؤں، گوٹھوں میں دیہاتی خواتین میں اس بات کا چرچا تھا کہ اگر اچھا کام چاہیئے تو پاکستانی کھانے بنانا سیکھ لو، بہت سخی لوگ اور بے پناہ پیسے والے ہیں۔زندگی آسان ہو جائے گی۔

ہمارے گھر میں ماریا کھانا پکاتی تھی، آٹے کی روٹی ایسی گول، نرم اور مزیدار بناتی کہ پاکستان میں بھی کم کم لوگوں کو ہی نصیب ہو پاتی ہے۔ اس مرتبہ ایک عرصے کے بعد اسی سٹی کوس میں میرا جانا ہوا۔ پرانی جاپانی گاڑیوں پر حکومت نے پابندی عائد کرنے کے سبب یہ سٹی کوس اجڑ گیا ہے۔ جہاں ہزاروں لوگ کام کر رہے تھے، اب کل ملا کر سو افراد بھی نہیں ہوں گے۔ چاروں جانب ویرانی دیکھ کر دل بہت اداس ہوا۔ محسن نقوی کا یہ مصرعہ دماغ میں بہت دیر تک گونجتا رہا

ے اس دشت میں اک شہر تھا، وہ کیا ہوا؟ آوارگی

بہر حال مجھے کسی اجڑے شہر کا نوحہ تو نہیں کہنا، اس نگر کے خوبصورت اور محبت کرنے والے لوگوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ جو آج بھی رنگ، نسل، مذہب، زبان کے اختلاف کے باوجود ہم پاکستانیوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اس شہر کی آباد مسجد اور میرے پاکستانی نژاد جاپانی دوست یاماد اعجاز کا انگریزی سکول عہدِ رفتہ کی یاد دلاتے رہیں گے۔
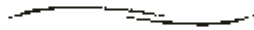
# چند دن چلی میں

پہلی مرتبہ چلی کا نام سن کر کسی ملک سے زیادہ سالم مرچ اور سرد موسم کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ ثابت سرخ مرچ کی شکل کا نقشہ اور سرد براعظم انٹارکٹکا کے ڈیڑھ لاکھ مربع میل کے علاقے پر دعویداری کے سبب چلی کے بارے ان ابتدائی خیالات کا آنا بے بنیاد بھی نہیں ہے۔ پونے دو کروڑ آبادی والے اس ملک کا رقبہ اس کے باشندگان کے تناسب سے کافی زیادہ ہے۔ خوبصورتی کا پہلو یہ ہے کہ تقریباً ہر شہر کو سمندر کا ساحل دستیاب ہے۔ آپ کہیں بھی ہوں سمندر آپ سے زیادہ دوری پر نہیں ہوگا۔

اس بار میرے دورے کے آغاز کے ساتھ ہی چلی میں زلزلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ سانتیاگو جو کہ دارالخلافہ اور سب سے بڑا شہر ہے اس کے ایئرپورٹ پر اترا ہی تھا کہ زلزلہ آ گیا۔ شمال کے اہم تجارتی شہر اقیقے پہنچا تو پھر زلزلے نے آن لیا اور آخری زلزلہ جس کی خبر آپ کے کانوں تک بھی پہنچی ہوگی۔ 8.3 درجے کا تھا پہلے تو زلزلے کے جھٹکوں کو

میں ہنسی میں ٹالتا رہا اور میر انیس کے شعر کے مصداق کہ ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' اپنی آمد کے اعزاز میں زمین کی جنبش سمجھتا رہا، مگر آخری زلزلہ جس کی شدت سیسمک سکیل پر 8.3 تھی اس نے تو میرا اپنا ''تراہ'' نکال دیا۔

تیس منزلہ عمارت کی چھٹی منزل پر گھر کی دہلیز پکڑ کر ہم اللہ اکبر اور کلمہ کا ورد کر رہے تھے اور ہمارے دائیں بائیں کے ہمسائے گھروں سے نکل کر یسوع مسیح کنواری مریم اور رحمت والے خدا کا نام لے کر ہاتھ سے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے چیخ و پکار کر رہے تھے۔ بزرگ، خواتین ہسپانوی زبان میں ''بیٹے، باپ، روح القدس'' کا ذکر اونچی آواز میں کر رہی تھیں۔ عام طور پر زلزلے کا دورانیہ چند سیکنڈ کا ہوتا ہے مگر اس کا دورانیہ دو منٹ سے بھی زیادہ تھا۔ اس لئے جب میرے کزن علی رضا نے تجویز دی کہ عمارت سے باہر نکل جانا چاہئے، تو میں نے بھی اسی میں سلامتی سمجھی۔ ایسی صورتحال میں لفٹ استعمال کرنا تو خطرناک عمل ہوتا ہے۔ اس لئے سیڑھیوں سے چھ فلور اتر کر باہر آ گئے۔ سامنے بحرالکاہل کی لہریں ساحل سے ایسے سر پٹخ رہی تھی کہ گونج سے سارے ماحول کو دہشت زدہ کر رہی تھیں۔ ہم چونکہ قدرے بلندی پر رہائش پذیر ہیں۔ اس لئے سونامی کی وارننگ کے باوجود ہم محفوظ علاقے میں تھے۔ آج شہر میں کرفیو کی سی کیفیت ہے اور ایمرجنسی کا اعلان کر کے فوج تعینات کر دی گئی ہے۔ زلزلے کا مرکز شمال میں ہی سمندر کے اندر 80 کلومیٹر تھا۔

چلی کا شمالی علاقہ تانبے کے ذخائر سے مالا مال ہے جس کی بدولت ملک تانبے کی برآمد میں عالمی سطح پر سرفہرست ہے۔ یہاں کی آنتا فگاستا کمپنی نے پاکستان میں بلوچستان کے اندر بھی ریکوڈک منصوبے میں بہت بڑی سرمایہ کاری کی تھی مگر سابق چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے حکومت کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ معیشت کو بھی

چلانے کے شوق کے سبب سارا منصوبہ کالعدم قرار پایا۔ وہ خود تو گھر بیٹھے پنشن لے کر مزہ کر رہے ہیں مگر ان کے اس فیصلے سے پاکستان اور چلی کے باہمی سفارتی تعلقات کو شدید دھچکا پہنچا۔ پاکستان آئندہ ماہ یہاں اپنا سفارت خانہ بند کر رہا ہے۔ جبکہ چلی پہلے ہی اسلام آباد میں اپنا قونصلیٹ بند کر چکا ہے۔

سیاسی اعتبار سے چلی دائیں بازو اور ترقی پسند خیالات کی قوتوں میں بٹا ہوا ہے۔ معاشرے میں یہ تقسیم بڑی واضح اور بہت گہری ہے۔ انگریز تو صرف نشے کی حالت میں سیاست پر ہی بات کرنا پسند کرتے ہیں مگر لاطینی امریکہ کے لوگ بڑے کھلے ڈھلے مزاج کے ہیں۔ ہر موضوع پر بے لاگ تبصرہ پیش کر دیتے ہیں۔ اہلِ یورپ کا عمومی سیاسی رویہ مگر اس کے برعکس ہوتا ہے، کئی سال پہلے صدارتی الیکشن کے دن ہمارے دوست اعجاز گوندل نے پنجابی روایات کے مطابق اپنے فرانس میں مقیم مالک مکان سے پوچھا کہ آج ووٹ کس کو ڈالو گے؟ فرانسیسی بڑھا مکان مالک سوال سن کر حیران رہ گیا۔ حیرت زدگی کے عالم میں کہنے لگا کہ یہ سوال تو میں اپنی بیوی سے بھی نہیں پوچھ سکتا ہوں۔ فرانس کی سوشلسٹ پارٹی کی طرح یہاں بھی حالیہ الیکشن سوشلسٹ پارٹی نے جیتا ہے۔ گزشتہ ماہ سوشلسٹ رہنما محترمہ مچیل باچیلیت دوسری مرتبہ ملک کی صدر منتخب ہوئی ہیں۔ دائیں بازو کے ایک اخبار نے تو آج صفحہ اول پر بڑا دلچسپ رنگین کارٹون شائع کیا ہے، جس میں محترمہ باچیلیت کو فیدل کاسترو کی فوجی ٹوپی، منہ میں سگار اور گوریلا داڑھی میں مسکراتے دکھایا گیا ہے، مگر کیوبا کے برعکس یہاں کی سرمایہ دارانہ نظام کی حامی سیاسی قوتیں بھی انتہائی طاقتور ہیں۔

محترمہ باچیلیت کے والد 1973ء کی فوجی بغاوت کے وقت ایئر فورس کے بریگیڈیئر تھے اور کمیونسٹ صدر سالوادور آئندے کے قریبی ساتھی سمجھے جاتے

تھے۔انہیں پورے ملک میں اناج کی تقسیم کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔جب جنرل آگستو پنوچے نے اپنی فوج، امریکی فضائیہ اور سی آئی اے کی مدد سے منتخب صدر آیندے کا تختہ الٹ دیا۔تو منتخب صدر باچیلیت کے والد کو بھی فوج نے حراست میں لے لیا تھا۔ بائیں بازو کے باقی زیرِحراست ہزاروں سیاسی کارکنوں کی طرح ان پر بھی روزانہ کی بنیاد پر تشدد کیا جاتا رہا۔آخر اسی حراست میں بریگیڈیر باچیلیت کا انتقال ہوگیا،نوبل انعام یافتہ شاعر اور سیاست وسفارتکار پابلو نرودا کی موت کا سبب فوجی اہلکاروں نے جیسے دل کا دورہ پڑنا بتایا،بالکل اسی طرح زیرحراست صدر باچیلیت کے والد کی موت کو بھی دل کا ناکام ہونا بیان کردیا۔جنرل پنوچے کے مظالم کا سلسلہ مگر یہیں ختم نہیں ہوا،محترمہ مچیل باچیلیٹ اور ان کی والدہ کو بھی زیرِحراست لے لیا گیا اور تادیر ان پر تشدد کیا جاتا رہا۔اس ایذا رسانی کا سلسلہ جلاوطنی پر ختم ہوا۔

تاریخ کے فیصلے بھی مگر عجیب ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر سے تھوڑا دور شہر کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے باہر شاعر خوش نوا پابلو نرودا کا قد آدم مجسمہ چمک رہا ہے۔شہر کے بیچ وبیچ ایک سڑک کے نام پر نظر پڑی تو شاہراہ سالوادور آیندے لکھا دیکھا۔چند قدم آگے اسی کمیونسٹ رہنما کا مجسمہ اور اس سے منسوب بچوں کا پارک دیکھا۔باچیلیت مرحوم کی بیٹی ایک مرتبہ پھر الیکشن جیت کر آتی ہے۔ اور حلف برادری سے پہلے سالوادور آیندے کی بھتیجی ازابیل آیندے اس کے گلے میں چلی کے پرچم کے رنگوں والا صدارتی ہار ڈالتی نظر آتی ہے۔حلف اٹھا کر ایک بار پھر وہ صدارتی محل میں ہے مگر سترہ سال تک مطلق العنان فوجی حکمران جنرل آگستو پنوچے کا آج نام لینے والا بھی کوئی نہیں۔تاریخ کا ذکر ہورہا ہے تو اس کی ایک اور ستم ظریفی یہاں قابلِ ذکر ہے۔چلی کا سوشلسٹ انقلاب وہ پہلا بائیں بازو کا انقلاب تھا جو انتخابات کے ذریعے سے آیا تھا۔سلوادور آیندے الیکشن میں واضح برتری سے

فتح حاصل کر کے صدارتی عہدے پر پہنچے تھے۔صدر آیندے ایک پکے جمہوریت پسند صدر تھے، روسی خفیہ ادارے KGB نے سوویت یونین کے صدر لیونڈ برژنیف کو یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ صدر آیندے جس جمہوری طرز سے حکومت چلا رہے ہیں، اس طرح یہ حکومت قائم نہیں رہ پائے گی، چلی کی فوج کا اقتدار پر قبضہ ناگزیر ہے، اس لیے سوویت یونین کو آیندے کی حکومت بچانے کے لیے اپنے وسائل ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔گو کہ KGB کی یہ پیش گوئی تو سچ ثابت ہوئی کہ اقتدار پر فوج نے قبضہ کر لیا مگر اندازے کی ایک فاش غلطی بس ان سے سرزد ہوگئی کہ جمہوری طرز سے ملک چلانے سے شاید سوشلسٹ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔تاریخ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ آیندے کی سوشلسٹ پارٹی تو آج پھر جمہوری انداز میں الیکشن جیت کر برسر اقتدار آ گئی ہے، مگر برژنیف کا سوویت یونین ٹوٹے ہوئے آج ربع صدی گزر گئی ہے۔KGB کے اندازے کی یہی غلطی شاید روسی سوشلزم کی ناکامی کا سبب بنی۔میں نے سنا ہے کہ جنرل ضیاء الحق اور فوجی آمر جنرل پنوچے میں بڑی دوستی تھی، تفصیل پھر کبھی بیان کروں گا۔
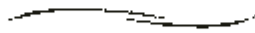
# ایسا منظر نہیں دیکھا

بحرالکاہل پر واقع خوبصورت ترین ساحلوں میں سے ایک کابانچا ہے۔گرمیوں کے موسم میں جنوبی امریکہ کے طول وعرض سے سیاح یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔آج کل یہاں سردیوں کا جوبن ہے۔یعنی ہم سے بالکل الٹ موسم ہے،مگر پھر بھی کثیر تعداد میں لوگ صبح،شام سمندر میں نہانے اور ساحل پر اٹھکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ساحل کے ساتھ ساتھ لکڑی سے بنائی گئی پگڈنڈیاں پیدل گشت کرنے کے لئے ایک رومانوی راستہ معلوم ہوتی ہیں۔چلی کے شمال میں واقع یہ ساحل اور اس سے ملحقہ شہر اقیقے تاریخی طور پر پیرو کا حصہ تھا۔انیسویں صدی کے آخر میں چلی کے ساتھ پیرو اور بولیویا کی ایک تاریخی جنگ ہوئی تھی۔اس جنگ میں چلی نے فتح یاب ہو کر نہ صرف یہ شہر بلکہ تمام شمالی علاقہ اپنے ملک میں شامل کر لیا تھا۔یوں کہہ لیں کہ ملک کا چوتھائی رقبہ اسی جنگ کی فتح کا انعام ہے۔رقبے کے اعتبار سے چلی ہم سے تھوڑا سا کم ہے۔یہ دنیا میں اڑتیسویں نمبر پر ہے جبکہ پاکستان اس کرہ ارض کا چھتیسواں بڑا ملک ہے۔ایک مقامی دوست کا اس بابت کہنا ہے کہ چلی جنوبی امریکہ کا اسرائیل ہے،جس نے ہمسایہ ممالک کا رقبہ اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ شمالی علاقہ اپنی بو،باس اور باشندوں کی شکل وصورت سے چلی سے زیادہ پیرو اور بولیویا کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

کل شام ڈھلے میں اسی ساحل کاپانچا کے کنارے لکڑی سے بنی پگڈنڈی پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ مجھے ساحلی سڑک کے اس پار لوگوں کا شور سنائی دیا۔اس کے ساتھ ہی کتے کے مسلسل بھونکنے کی آواز بھی سنی۔شور میں اضافہ اور فضا میں بے چینی بڑھی تو میں متوجہ ہوا۔گھر سے روزہ افطار کر کے نکلا تھا اور واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی، اسی لئے جب لوگوں کا بڑھتا ہوا رش دیکھا تو گھاس کی ٹکریوں اور دورویہ سڑک کو پار کر کے میں دوسرے کنارے جا پہنچا۔منظر تو کچھ ایسا عجیب نہیں تھا۔ایک گلٹر یا نسل کے کیم شحیم کتے نے ایک چھوٹے کتے کو، جیسے آپ روئی پست قامت سفید کتا تصور کر سکتے ہیں، کمر سے دبوچ رکھا ہے اور اسے بھنبھوڑ رہا ہے۔یقیناً کسی بھی اہلِ دل کے لئے یہ خوشگوار منظر نہیں ہے۔بلاشبہ دردناک ہے۔مگر یہاں تو اردگرد قیامتِ صغریٰ برپا تھی۔میں نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ اس صورتحال میں کیا مدد کی جا سکتی ہے؟ مگر یہاں تو دو درجن سے زیادہ مددگار پہلے ہی جمع ہو چکے ہیں۔سادہ لباس میں ملبوس سڑک کنارے ریستوران کی نوعمر ویٹرس چلا چلا کر اپنے ساتھی ویٹروں سے کہہ رہی تھی کہ چھوٹے کتے کے بوڑھے مالک کے لئے کرسی لے کر آؤ۔جلدی کرو۔بڑھا بہت نروس ہے۔ارے! کتے کے لئے پانی لیکر آؤ، ایک اور دردمند آواز بلند ہوئی۔

اس دوران میں نے دیکھا کہ گلٹر یا مضبوطی کے ساتھ دانت روئی کتے کی پشت پر گاڑھے ہوئے ہے اور بہت سارے لوگ چھوٹے کتے کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔سڑک کے کنارے گاڑیاں کھڑی ہونا شروع ہو گئیں۔لوگ گاڑیوں سے نکل کر اس پوڈل کتے کی مدد کرنیکی کوشش میں، اس کے مالک کی پریشانی بیان سے باہر ہے۔اسی اثناء میں کولمبیا سے تعلق رکھنے والا ایک لڑکا آگے بڑھا اور اس موٹے گلٹر یا کتے کو زور زور سے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے، یہ فارمولا کارگر ثابت ہوا اور گلٹر یا نے چھوٹے کتے کو چھوڑ کر گھر کی راہ لی۔مگر معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا۔میں نے بھی سوچا کہ میں آخری تماشائی تک یہ منظر دیکھوں گا۔چھوٹا کتا چھوٹ تو گیا مگر زخمی ہو گیا تھا۔سفید کھال پر خون کا

سرخ رنگ واضح بتا رہا تھا۔ ویٹرس لڑکی چلائی کہ کوئی ٹیکسی روکے اور زخمی کتے کو اسپتال پہنچائے۔ دوسری آواز آئی کہ پہلے اسے پانی تو پینے دیجئے۔ ارے کوئی بیچارے بڈھے کے لئے ابھی تک کرسی کیوں نہیں لایا۔ ٹیکسی کے پیسے آپ کے پاس ہوں گے؟ اور کتے کے ٹریٹمنٹ کے لئے؟ میں نے دیکھا کہ اردگرد کھڑی خواتین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں اور مرد بھی افسردہ کھڑے ہیں۔ کرسی پر ہانپتے کانپتے بڈھے کو سب دلاسہ دینے لگے کہ بابا جی! یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا، معمولی سا زخم ہے۔ ارے کوئی ٹیکسی روکے جلدی سے، ایک خاتون نے آواز اٹھائی کہ جانوروں کا ہسپتال کہیں بند ہی نہ ہو جائے!! دیر ہو رہی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون جو کہ ابھی چم چم کرتی نئی مرسڈیز کار سے اتری تھی، کہنے لگی ٹیکسی روکنے کی ضرورت نہیں، کتے اور اسکے بڈھے مالک کو میں اسپتال پہنچا دیتی ہوں۔ روسی کتے کا بوڑھا مالک جو معمولی لباس پہنے ہوئے غریب آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا، لوگوں نے اپنا اپنا مشورہ دیا کہ کتے کو کیسے پکڑیں، اسی دوران کسی نے اسے سفید پٹی بھی باندھ دی تھی تا کہ زیادہ خون نہ بہہ جائے۔ خاتون نے اپنی مرسڈیز سٹارٹ کی اور دونوں کو اسپتال کی طرف لے کر روانہ ہوگئی۔ عرب و عجم کے کسی مسلمان دیس میں آج تک میں نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا۔ شاید رمضان المبارک کا اثر ہے، میرے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ قارئین سے یہ پوچھ لوں شائد انہوں نے کسی مسلمان ملک میں کوئی ایسا واقعہ دیکھا ہو؟ فضول سوال ہے۔ بھول جائیے۔ چلی کی بات کرتے ہیں جس کی آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ ہے۔ مقامی کرنسی پیسو ہے۔ ہمارے ایک روپے میں چھ پیسو آ جاتے ہیں۔

روسی کتے کے ذکر سے مجھے شہر میں آئی ہوئی روسی سرکس یاد آ گئی۔ شب جمعہ کو بلیک میں ٹکٹ لے کر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس طرح ہمارے ملک میں لگی ایرانی سرکس میں کوئی ایرانی فنکار نہیں ہوتا۔ اسی طرح روسی سرکس میں کسی ایک فرد کا بھی مقام پیدائش روس نہیں تھا۔ زیادہ تو کیوبا یا پھر وینزویلا کے فنکار تھے۔ لاطینی امریکہ میں ملکوں کا تصور ایشیا جیسا نہیں ہے۔ یہاں ایک ملک سے دوسرے ملک چلے جانا ایسا ہی ہے جیسے ہمارے

ہاں ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا ہے۔جنوبی امریکی ممالک میں باہمی سفر کے لئے پاسپورٹ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، ان ممالک کے باشندے اپنے قومی شناختی کارڈ دکھا کر عالمی سرحد عبور کر لیتے ہیں۔اس کی وجہ سادہ سی ہے، ان ممالک کے درمیان دوستانہ خارجہ تعلقات ہیں۔ویسے تو اس خطہ ارض کے لوگوں کا عمومی رویہ ہی بڑا دوستانہ ہے۔ ساحل کنارے جس کیفے ٹیریا کی کرسی پر بیٹھا میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں اور سمندر کی لہروں کا شور سن رہا ہوں۔آج اس کے مالک نے مجھے میرے نام سے بلایا۔حالانکہ میں صرف ایک دفعہ پہلے یہاں آیا تھا۔اور میری کافی کے کاغذی کپ پر میرا نام لکھنے کے لئے اس نے تعارف پوچھا تھا۔میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اوپن ائیر کیفے کے مالک سے کہا کہ تمہیں میرا نام یاد ہے؟ اس پر اس نے از راہِ مذاق کہا کہ آج تک تو یاد ہے کل ضرور بھول جاؤں گا۔

دور افتادہ ملک کے اس چھوٹے سے جنت نظیر ساحلی شہر میں پاکستانیوں کی تعداد تین سو سے چار سو کے درمیان ہے۔بیس برس پہلے میرے بڑے بھائی کاروبار کی غرض سے اس شہر میں پہلی مرتبہ تو انہیں اقیقے میں ایک سکھ ملا۔ بھائی جان نے حیرت زدہ ہو کر اس سے پوچھا کہ سردار جی! آپ یہاں بھی پہنچ گئے؟ جواب میں سکھ کا کہنا تھا کہ جہاں بھی آلو پیدا ہوگا وہاں پر سکھ ضرور ہوگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سردار جی کا اقوالِ زریں ہم پاکستانیوں پر بھی صادق آتا ہے۔بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جہاں آلو نہیں بھی ہوگا، پاکستانی وہاں بھی ضرور ہوگا۔یہاں تقریباً تمام پاکستانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک ہیں۔شہر میں حضرت بلالؓ کے نام سے موسوم ایک خوبصورت جامع مسجد قائم ہے، جو انہی پاکستانیوں نے تعمیر کی ہے۔اس کے علاوہ چند مصلے بھی قائم ہیں جن میں سے ایک ہمارے شوروم کی بالائی منزل پر ہے۔کاروباری اوقات میں یہاں باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔

# پابلو نرودا کے حضور

پابلو نرودا بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ تحسین کے یہ الفاظ میرے نہیں بلکہ نوبیل انعام یافتہ صحافی اور ادیب گبریل گارسیا مارکیز کے ہیں، جن سے کسی بھی صاحبِ مطالعہ شخص کا اختلاف کرنا آسان نہیں ہے۔ نرودا کے فن کے حوالے سے تذکرے تو ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں، اور اس خوش نوا شاعر کا ذکر تب تک جاری رہے گا جب تک یہ دنیا اور اس میں ادب باقی ہے۔ چلی کے اس انقلابی شاعر، ادیب، سفارتکار اور ترقی پسند سیاستدان کی شخصیت کا ایک خوبصورت پہلو ایسا ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں، اس لیے اس ہمہ جہتی شخصیت کی اس جہت کا تذکرہ بھی کم کم ہوتا ہے۔ یہ پہلو پابلو نرودا کی فنِ تعمیر میں دلچسپی ہے۔ اس دلچسپی کا مظہر اس کے چلی کے مختلف شہروں میں خود تعمیر کردہ تین مکانات ہیں۔ ان گھروں کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ تعمیر کے شعبے کو فن اور آرٹ کیوں کہا جاتا ہے۔ دارالحکومت سنتیاگو میں واقع رہائش گاہ کی لائبریری میں اس کے

اپنے ہاتھ سے بنا ہوا ایک گھر کا ماڈل پڑا ہے، جو کبھی تعمیر نہیں ہو سکا۔

بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے پابلو نرودا کی تدفین اس کی وصیت کے مطابق، اسکے ازلا نیگرا کے ساحل پر واقع گھر کے صحن میں ہوئی۔ بعد ازاں اسکے پہلو میں اسکی شریکِ حیات متلدے کی بھی تدفین کر دی گئی۔

پابلو نرودا کی تینوں رہائش گاہوں کو عوامی میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے، ان کا انتظام و انصرام اسی کے نام سے منسوب ایک فلاحی ادارہ چلاتا ہے۔ یوں تو تینوں مکانات قابل دید ہیں مگر ان میں سیاحوں میں زیادہ مقبول دارالخلافہ سنتیا گو شہر میں واقع مکان ہے۔ میرا اس شہر سے جب بھی گزر ہوتا ہے، میں اس آستانے پر حاضری کے لیے ضرور جاتا ہوں۔ ہر بار یہاں حسن اور آرٹ کا کوئی نہ کوئی نیا رخ آشکار ہوتا ہے۔ کم وبیش چار کنال رقبے پر مشتمل اس رہائش گاہ کا نام نرودا نے اپنی محبوبہ کے گھنگھریالے بالوں کی نسبت سے ''لا چسکونا'' رکھا تھا۔ ریڈ انڈین قبائل کی زبان ''کیچوا'' کے اس لفظ کا ترجمہ الجھے ہوئے بالوں والی یا پھر زلفِ پریشان کیا جا سکتا ہے، نرودا اپنی محبوبہ کو اسی نام سے بلایا کرتا تھا۔ پہاڑی پر واقع اس مکان کی تعمیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ ناہموار پہاڑی کے پیچ وخم اور زیر وبم کو ان کی قدرتی حالت میں ہی رہنے دیا گیا ہے۔

الگ تھلگ اک ننھی چوٹی پر واقع کشادہ لائبریری کی تمام کتابیں اور دیگر سامان تو 1973ء کی فوجی بغاوت کے وقت یہاں سے لوٹ لیا گیا تھا، اب اسے سفارتکاری کے دور میں نرودا کے زیر استعمال رہنے والی اشیاء وکتب سے سجایا گیا ہے۔ دیواروں پر بلیک اینڈ وایٹ تصاویر آویزاں ہیں، جن میں نرودا اپنے دوستوں کے ساتھ نظر آتا ہے، ان میں کئی نوبیل انعام یافتگان اور عالمی شہرت یافتہ انقلابی رہنما شامل ہیں۔ پابلو پکاسو اور ڈیگو رادیرا کے ساتھ پابلو نرودا کی تصاویر کے علاوہ ان مصور دوستوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی بہت ساری

پینٹنگز گھر میں جا بجا سجی ہوئی ہیں۔ بیڈ روم میں میکسیکو کے نوبیل انعام یافتہ مصور ڈیگو راویرا، جو مصورہ فریدا کے شوہر کے طور پر زیادہ مشہور رہیں، ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی نرودا کی محبوبہ کی مبہوت کر دینے والی پینٹنگ آویزاں ہے۔ محبوبہ کی الجھی زلفوں میں نرودا کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

گھر کی دیواروں پر سجی تصویروں میں نظر آنے والی شخصیات میں اگر تمام نہیں تو غالب اکثریت اشتراکی نظریات کے حامیوں پر مشتمل ہے۔ یاد رہے کہ پابلو نرودا عملی طور پر سرگرم انقلابی سیاستدان تھے۔ وہ چلی کی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ اور سینیٹر بھی رہے۔ ان کی پارٹی کی طرف سے انہیں ملک کی صدارت کے عہدے کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا تھا مگر وہ اپنے ہمدم دیرینہ کامریڈ سالوادور آیندے کے حق میں دستبردار ہو گئے، جو پھر انتخابات چلی کے صدر منتخب ہوئے۔ جنرل پنوچے کی قیادت میں فوجی بغاوت کے دوران دونوں دوستوں کی وفات مشکوک حالات میں ہوئی۔ عوام کی غالب اکثریت کا خیال ہے کہ دونوں کو قتل کیا گیا۔ چند سال قبل حکومت نے پابلو نرودا کی موت کے اصل اسباب جاننے کیلئے ایک عدالتی کمیشن قائم کیا تھا، جس کی تحقیقات 2011ء سے ابھی تک جاری ہیں۔ حکومت وقت کا دعویٰ تھا کہ اسے دل کا جان لیوا دورہ پڑا تھا، جبکہ عمومی رائے یہ ہے کہ اسے زہر دے کر مارا گیا تھا۔ جنرل پنوچے نے نرودا کے جنازے کو عوامی اجتماع میں تبدیل ہونے سے روکنے کی خاطر سینٹیاگو شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ لوگ مگر پھر بھی کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، جوق در جوق ملک کے طول و عرض سے ہزاروں کی تعداد میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر جنازے میں شریک ہوئے۔ واقفانِ حال بتاتے ہیں کہ شہر کی گلیاں اور بازار لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئے تھے۔ محبت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ موت سے ایک ماہ قبل ہی نرودا نے اپنی آپ بیتی مکمل کی تھی، فوجی بغاوت کے بعد اسکی بیوی متلدے یہ

''یادیں'' لیکر ملک سے فرار ہوگئی تھی۔ یہ آپ بیتی جس کا عنوان ''یادیں'' ہے اب اردو سمیت دنیا کی بیشتر زبانوں میں شائع ہوچکی ہے۔ اردو ترجمہ انوار زاہدی نے کیا ہے۔

چلی کے سرسبز وشاداب جنوبی علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے پارال میں 1904ء کو پیدا ہونے والا ریکارڈو نیفتالی باسوآلتو بچپن سے ہی شاعرانہ اور سوشلسٹ مزاج رکھتا تھا۔ دس سال کی عمر میں اسکی پہلی نظم شائع ہوئی۔ فقط انیس برس کا تھا جب اسکی پہلی کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ والد کو اس کا شاعری کرنا پسند نہ تھا، اسکی وجوہات سماجی اور معاشی تھیں۔ چونکہ وہ صرف دو ماہ کا تھا جب اسکی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ شاید اسی لیے والد اس کے مستقبل کے بارے میں زیادہ حساس تھے، اپنے والد کو غچہ دینے کیلئے اس نے قلمی نام پابلو نرودا اختیار کرلیا۔ چیک ریپبلک سے تعلق رکھنے والا رومانوی شاعر نرودا اس کا پسندیدہ سخنور تھا۔ اسی کے نام سے متاثر ہوکر اس نے اپنا نام رکھا، بیس برس کی عمر تھی جب اس کا دوسرا شعری مجموعہ ''محبت کی بیس نظمیں'' شائع ہوا، جس نے پوری دنیا سے دادوتحسین سمیٹی۔ سارے عالم میں شہرت کے باوجود اسکے معاشی حالات دگرگوں تھے۔ دوستوئیفسکی کے الفاظ میں حالت بیان کروں تو ''شہرت چاہے لافانی بھی ہو، اس سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا'' روزگار کی خاطر اس نے دفتر خارجہ میں نوکری اختیار کرلی۔ ذہین اور محنتی ہونے کے سبب اس نے جلد ہی نہ صرف چلی بلکہ بیرونی دنیا میں بھی ایک منجھے ہوئے سفارتکار کے طور پر خود کو منوالیا تھا۔ سیاسی حالات بدلتے ہیں تو اسے روپوشی اور جلاوطنی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس کی تفصیل نرودا کے متعلق میری کتاب ''محبت کے دو رنگ'' میں موجود ہے۔ میرے لیے یہ اعزاز ہے کہ میں نے پابلو نرودا کی شاعری کو ہسپانوی سے اردو میں ترجمہ کر کے کتابی شکل میں شائع کروایا۔ جلاوطنی کے دور میں نرودا کا تخلیقی سفر اور سیاحت دونوں بھرپور طریقے سے جاری رہے۔ اس پر اطالوی زبان میں ایک ایوارڈ یافتہ فلم بھی بنی ہے ''IL

POSTINO" جوزودا کی جلاوطنی کے دوران اٹلی کے جزیرے کیپری میں قیام کا احاطہ کرتی ہے۔

بحری سفر سے نرودا کی رغبت کا یہ عالم تھا کہ سنیا گو کے گھر کا ایک حصہ بالکل بحری جہاز کے اندر کا ماڈل ہے۔ جبکہ دوسرے گھر میں ایک کشتی بنی ہوئی ہے۔ دونوں میں مئے خانے قائم کیے گئے تھے۔ مئے خانے اور باورچی خانے میں شیشے کے رنگ برنگے گلاس رکھے ہوئے ہیں۔ شاعر کا عقیدہ تھا کہ گلاس کا رنگ بدلنے سے مشروب کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ گھر میں روایتی نہیں بلکہ پتھریلی ناہموار زمین پر باغبانی کی گئی ہے، جو بذات خود آرٹ کا شاہکار ہے۔ لائبریری کے ایک کونے میں گتے اور لکڑی سے بنا ہوا ایک گھر کا ماڈل رکھا ہے، جو کہ پابلو نرودا کے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا ہے۔ نوبیل انعام، عالمی امن انعام اور لینن امن انعام یافتہ شاعر اسے تعمیر کروانا چاہتا تھا مگر زندگی نے مہلت نہ دی، 69 برس کی عمر میں وہ عالم رنگ وبو کو داغ مفارقت دے گیا۔
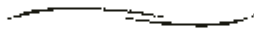
# سینتا گو کی ایک صبح

صبح کا آغاز سنتیا گو میں بلیک کافی کے ساتھ ہوا۔ اس کی وجہ میری سادہ خوراکی مت سمجھیے گا بلکہ کمرے میں اور کچھ دستیاب ہی نہ تھا۔ ہوٹل کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو سانتا لوسیا کی پہاڑی پر ہسپانوی دور کی یادگار عمارتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ سولہویں صدی کے وسط میں جب سپین نے اس شہر کو فتح کیا تو اس پہاڑی مقام پر اپنی فتح کی یادگار تعمیر کروائی۔ ڈیڑھ کروڑ سال پرانی یہ پہاڑی کبھی آتش فشاں کا دہانہ تھی، اپنی دفاعی اہمیت کی وجہ سے ہسپانوی فوجوں نے اس پر دو قلعے بھی تعمیر کروائے اور عملی طور پر اسے فوجی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا۔ وقت گزرتا گیا مگر اب بھی یہ چلی کے دارالحکومت کا مرکزی نقطہ اور سب سے مقبول سیاحتی مقام ہے۔ اس شہر کے معمار ہسپانوی فاتحین ہیں اور اس کا نام بھی انہی نے انجیل مقدس سے اخذ کر کے رکھا تھا۔

سنٹیا گو میں اپنے قیام کے لیے ہوٹل میں نے قصداً اس جگہ منتخب کیا تھا جہاں سے میوزیم اور تاریخی عمارات قریب ہوں، تا کہ وقت کا بہترین استعمال ہو سکے۔ نیشنل

میوزیم میں داخل ہو رہا تھا کہ مجھے دو خانہ بدوش لڑکیوں نے روک لیا، یورپ میں جنہیں ''روما'' اور لاطینی امریکہ میں ''خی طانو'' کہتے ہیں۔ میری گفتگو کرنے میں ہچکچاہٹ دیکھ کر کہنے لگیں کہ دیکھو ہم بھی تمہاری طرح کے انسان ہی ہیں، ہم سے ڈرو مت تھوڑی دیر بات کر لینے میں تمہارا کچھ بھی خرچ ہونے والا نہیں ہے۔ اسی دوران ستر، اسی سال کے پیٹے میں ایک بزرگ جوڑا، جن کی میں نے تھوڑی دیر پہلے ان کے کیمرے سے ہسپانوی طرزِ تعمیر کے عجائب گھر کی اس عمارت کے سامنے یادگاری تصویر بنائی تھی، وہ میری مدد کو پہنچے اور بہانے سے مجھے بلانے لگے کہ میوزیم کا داخلی دروازہ اور ٹکٹ گھر اس طرف ہے، ہمارے ساتھ آؤ!!! پھر یہ شفیق بزرگ مجھے سمجھانے لگے کہ یہ خانہ بدوش لڑکیاں بہت خطرناک ہوتی ہیں، یہ تم سے تمہارا کیمرہ، بٹوہ، سارا سامان اور گھڑی، سب کچھ چرا کر لے جائیں گی اور تمہارے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ لمبے سنہری بالوں، سفید رنگت اور سبز آنکھوں والی یہ دبلی پتلی لڑکیاں بظاہر تو اتنی خطرناک نہیں لگ رہی تھیں۔ ان کے جسم پر بنے ہوئے ٹیٹو البتہ بتا رہے تھے کہ معاملہ اتنا سادہ بھی نہیں ہے۔ یوں تو لاطینی امریکہ میں کئی سال گزارنے اور ہسپانوی زبان جاننے کے سبب ان ''خی طانو'' خانہ بدوشوں کے متعلق میں کئی کہانیاں سن چکا تھا، دست شناسی، ٹیرٹ کارڈ، ستارہ شناسی اور چوری چکاری تو ان کی وجہ شہرت ہے ہی، بغیر کسی پاسپورٹ اور ویزے کے سارے لاطینی امریکہ میں گھومنے پھرنے والے ان خانہ بدوشوں کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ ان کی محبت مرنے اور مار دینے والی ہوتی ہے۔ مقامی بزرگ جوڑے کے سامنے مگر میں انجان بن گیا اور ان کا شکریہ ادا کیا، پھر ان کے ساتھ ہی میوزیم دیکھنے کے لیے مرکزی دروازے سے داخل ہو گیا۔

سنٹیا گو شہر میں چار بڑے میوزیم ہیں، نیچرل ہسٹری قومی تاریخی ورثہ، جدید آرٹ اور کمال فن میوزیم۔ ان کے علاوہ چار خصوصی عجائب گھر ہیں جن میں سے ایک گزشتہ صدی کی نوبل انعام یافتہ شاعرہ گبریلا مسترال سے منسوب ہے، دو اور قومی ہیرو اور ایک تاریخ دان کے نام سے نسبت رکھتا ہے۔ گبریلا مسترال کہ جن کی شاعری کا اردو زبان میں

ترجمہ کر کے شائع کروانے کا اعزاز مجھے حاصل ہے، ان کے نام سے میوزیم اسی سکول کی عمارت میں قائم ہے جہاں یہ عہد ساز شاعرہ اور ماہر تعلیم ننھے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتی رہی۔ پھر قومی کتب خانہ میوزیم بھی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سب عجائب گھروں میں داخلہ بالکل مفت ہے۔

چلی کے انقلابی شاعر پابلو نرودا کے گھر، بلکہ تینوں گھروں کو بھی عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ عجائب گھر کہنا عجیب سا لگتا ہے، سیاحتی مقام کہہ لیں، کیونکہ گھر تو تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے یہ خوش نوا شاعر چھوڑ کر گیا تھا، ماسوا اس بات کے کہ ازلا نیگرا والے گھر کے صحن میں پابلو نرودا اور اس کی بیوی متلدے کی قبروں کا اضافہ ہوگیا ہے۔

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور

ان رہائش گاہوں میں داخلے کی مگر بھاری ٹکٹ ہے، کیونکہ یہ سرکاری عمارتیں نہیں ہیں اور پابلو نرودا کے نام سے قائم ایک غیر سرکاری ادارہ ان کی دیکھ بھال اور انتظام چلاتا ہے۔ لاہور میں فیض احمد فیض کا گھر بھی سیاحتی مقام میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ فیض گھر کے منتظمین جس خوبصورتی سے اس کا انتظام و انصرام چلا رہے ہیں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ فیض گھر اپنے محدود وسائل کے باوجود پاکستانی معاشرے کو ایک جدید ریاست بنانے میں قابل قدر کردار ادا کر رہا ہے۔ اس ادارے میں آویزاں فیض صاحب اور پابلو نرودا کی تصویر بتاتی ہے کہ رومان اور انقلاب کے داعی ان دونوں شعراء میں کافی گہرا تعلق تھا۔

چلی کوئی امیر ریاست نہیں ہے اور نہ ہی اس کے پاس لامحدود وسائل ہیں مگر سنٹیاگو شہر کے ایک درجن عجائب گھروں کا تذکرہ تو میں آپ سے کر ہی چکا ہوں۔ لاہور شہر سنٹیاگو سے بڑا ہے مگر پورے شہر میں صرف ایک ہی مرکزی عجائب گھر ہے اور وہ بھی انگریز کا

تعمیر کردہ۔ اسلام آباد کا لوک ورثہ اور مونومنٹ بھی حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں اور کراچی کا حال بھی کوئی مختلف نہیں ہے۔ ہمارے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں تو یہ ادارے موجود ہی نہیں ہیں۔ عجائب گھر قومی تعمیر و ترقی میں یوں اہم ہیں کہ یہ عوام کا رشتہ دھرتی سے مضبوط کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ماضی اور حال میں تعلق پیدا کر کے مستقبل کی سمت کا تعین کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ شہر کا مرکز انیسویں صدی کے کلاسیکی طرز تعمیر کا شاہکار نمونہ ہے جس میں کہیں کہیں جدید طرز تعمیر کے خوبصورت پیوند بھی نظر آجاتے ہیں۔ شہر کے عین وسط میں بہنے والے ماپوچو دریا کو سنٹیا گو میں وہی مقام حاصل ہے جو لاہور میں نہر کو اور لندن شہر میں دریائے تھیمز کا مقام ہے۔ چاروں اطراف سے برف پوش لاس آندیس کی پہاڑیوں میں گھرے اس شہر کا زیر زمین ریلوے نظام جنوبی امریکہ میں سب سے جدید، بڑا اور مثالی ہے۔ عوام الناس کی بڑی اکثریت اسی زیر زمین ریلوے اور میٹرو بس کو آمدورفت کے لیے استعمال کرتی ہے جس کی وجہ سے شہر کی سڑکوں پر زیادہ گاڑیوں کا رش نظر نہیں آتا۔

شہر کے مضافات میں انگور کے باغات کا طویل سلسلہ ہے، انہی انگوروں سے کشید کردہ وائین اس وقت دنیا میں فرانس کے بعد سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہے۔ شراب کشید اور فروخت کرنے والی ایک کمپنی کے یہودی مالک سے ایئرپورٹ پر ملاقات ہوئی تو اس نے عجیب انکشاف کیا، کہنے لگا کہ چلی میں انگور کے باغات اور شراب کشید کرنے والے تقریباً تمام اداروں کے مالکان وہی یہودی خاندان ہیں جو گزشتہ صدی میں اہل یورپ کے متعصب رویوں کے سبب ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ فرانس اور سپین سمیت یورپ کے بیشتر ممالک میں ان کے رشتہ دار ہی شراب ساز اداروں کے اب بھی مالکان ہیں۔ اسی دوران گڈمین نامی اس یہودی کا فون آگیا، اس نے اپنی بیوی کو بڑی نرمی سے بتایا کہ میں اس وقت ایک پاکستانی نوجوان سے بات چیت میں مصروف ہوں، فارغ ہو کر تمہیں فون کروں گا۔ بتانے لگا کہ میرے پاس چلی کے علاوہ اسرائیل کا بھی پاسپورٹ ہے مگر میں اسرائیلی پاسپورٹ کو سفر کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ اگر جہاز

اغوا ہو جائے تو ہائی جیکر چاہے کہیں کے بھی ہوں، پہلی گولی وہ اسرائیلی یہودی کو ہی مارنا پسند کریں گے۔ اسرائیلی ریاست کے غیر فطرتی قیام کی یہ قیمت تو یہودیوں کی آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی ادا کرنا پڑے گی۔

# شاعروں اور ادیبوں کا وطن

اس کرۂ ارض پر انسان کا قدیم ترین مسکن یہ دیس ہے۔ماہرین آثارِ قدیمہ کے مطابق چلی میں بہتر ہزار سال قبل انسانی زندگی کے آثار ملے ہیں۔ذاتی طور پر مگر میں یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ یہی بات میں دنیا کے آدھ درجن ممالک میں ان کے متعلقہ اوصاف کی فہرست میں سُن چکا ہوں۔حال ہی میں سری لنکا میں وہ پہاڑی چوٹی دیکھی جس پر حضرت آدمؑ کے پاؤں کا نشان ثبت ہے، انہی کے نام یہ چوٹی ''ایڈمز پیک'' موسوم ہے۔مبینہ طور پر اس جگہ پہلے انسان اور خدا کے پیغمبر کا نزول ہوا تھا۔اسلام، بدھ مت اور عیسائیت کے پیروکاروں کے لیے مذکورہ مقام یکساں طور پر متبرک اور عبادت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔چلی کی پوری دنیا میں البتہ ایک انفرادیت ایسی ہے جو کہ غیر متنازعہ ہے اور پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے، ملک کے اندر اور عالمی سطح پر چلی کو شاعروں کا وطن اور ادیبوں کی سرزمین مانا جاتا ہے۔جنوبی امریکہ کے حسین دیس کے لیے یہ خطاب اور اعزازی جملے محض لفاظی یا شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے، بلکہ اس کی ٹھوس اور تاریخی وجوہات ہیں جو اس توصیف کو برحق ثابت کرتی ہیں۔

لاطینی امریکہ میں ادب کا پہلا نوبل انعام گبریلا مسترال کو دیا گیا جو کہ چلی میں پیدا ہوئیں، یہیں پر پلی بڑھیں، شاعری کا آغاز اور اشاعت کا سلسلہ بھی اسی حسین دیس

سے کیا۔ سفارت کاری اور تعلیم کے شعبے میں عالمی سطح پر اپنے ملک کی نمائندگی کی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اپنی زندگی میں ہی وہ اتنے بلند مقام پر پہنچ چکی تھیں کہ اٹلی کے مطلق العنان آمر مسولینی نے انہیں وزارت کی پیشکش کی جسے گبریلا مسترال نے ٹھکرادیا، کیونکہ نرم خو شاعرہ جمہوریت اور انسانی حقوق کے تحفظ میں یقین رکھتی تھی۔ نقشہ دیکھیں تو جنوبی امریکہ میں ارجنٹائن اور برازیل کے پہلو میں ایک طویل ساحلی پٹی ''سبز مرچ'' کی طرح دکھائی دیتی ہے، قرین قیاس یہی ہے کہ ثابت مرچ جیسی شکل کی بنیاد پر ہی اس ملک کا نام چلی رکھ دیا گیا ہے۔ ارجنٹائن اور چلی کے درمیان سینکڑوں میل تک پھیلے لاس آندلیس کے برفیلے پہاڑ جن کی برف پوشی کے سبب اردگرد کے نواحی شہروں کا موسم بھی سرد رہتا ہے، ذہن میں آتا ہے کہ شاید وہ ٹھنڈک اس چلی نام کا سبب ہو؟ حقیقت میں مگر ایسا نہیں ہے۔ سرخ مرچ، برفانی پہاڑ اور انٹارکٹکا کا سرد موسم چلی کی وجہء تسمیہ نہیں ہیں۔ دراصل قدیم قبائل کی زبان کے مطابق چلی کا مطلب خشکی کا آخری ٹکڑا یا پھر زمین کا آخری حصہ ہے۔ یہاں یہ تذکرہ کرتا چلوں کی براعظم انٹارکٹکا کا کچھ حصہ چلی کی عملداری اور بہت بڑا حصہ اس کی دعوی داری میں آتا ہے۔

پابلونرودا کے ذکر کے بغیر عالمی ادب کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔ اس خوش نوا شاعر کو نوبیل انعام ملنے سے کہا جاتا ہے نوبیل انعام کی تکریم میں اضافہ ہوا ہے، چونکہ نرودا نے اسے قبولیت بخشی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دنیا میں پابلونرودا زیادہ مقبول ہیں یا پھر چلی کو زیادہ لوگ جانتے ہیں۔ ذاتی حوالے سے بات کروں تو میں نے پابلونرودا کا نام پہلے سنا تھا اور اس کے حوالے سے چلی کا تذکرہ بعد ازاں سننے میں آیا کہ یہ بھی لاطینی امریکہ کا ملک ہے۔ دو کروڑ آبادی کے اس ملک کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس ملک کا مجموعی رقبہ پاکستان سے تھوڑا سا کم ہے یعنی عالمی فہرست میں پاکستان چھتیسواں بڑا ملک ہے اور چلی اٹھتیسواں ملک شمار ہوتا ہے۔ ملک میں صدارتی نظام ہے اور موجودہ صدر محترمہ باچلیت

ہیں، جو کہ سوشلسٹ پارٹی کی رکن ہیں۔محترمہ باچلیت کے والد پابلوزودا کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔یاد رہے کہ پابلوزودا فقط شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک منجھے ہوئے سفارت کار اور سیاستدان بھی تھے۔کیمونسٹ پارٹی کی طرف سے ان کو صدارت کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا تھا اور وہ سینیٹر بھی رہے تھے۔

پابلوزودا نے اپنی سیاسی جدوجہد اور سماجی کاوشوں سے یہ ثابت کیا کہ شاعر اور اہلِ قلم کا منصب فقط یہ نہیں کہ گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوکر ان کو ضبطِ تحریر میں لے آئے بلکہ اپنے سماج کو سدھارنے اور اردگرد کے حالات کو مثبت انداز میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری بھی اس کے کاندھوں پر آتی ہے۔پابلوزودا بھی گبریلامسترل کی طرح چلی کے جنوبی علاقہ میں پیدا ہوا جو کہ بہت سرسبز ہے، مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان دونوں عظیم شعراء کی شاعری کو میں نے ہسپانوی زبان سے براہِ راست اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان شعراء کی جائے پیدائش کا تذکرہ کرنے کا مقصد وہ پس منظر اور فطرتی ماحول ہے جس میں ان کی شاعری پروان چڑھی ہے۔یوں تو اس ملک کے تقریباً ہر شہر کو ساحلِ سمندر کی نعمت میسر ہے مگر شمال کا علاقہ خشک ٹیلے پہاڑوں اور جنوبی علاقہ سرسبز اور برف پوش پہاڑوں پر مشتمل ہے۔سولہویں صدی میں یہاں ہسپانوی نوآبادیاتی نظام قائم ہوا، اس سے پہلے یہ قدیم ''اِن کا'' ریاست کی عملداری میں تھا۔دارالحکومت سنتیا گو کی بنیاد 1540ء میں ہسپانوی سلطنت نے رکھی۔آزادی کا اعلان 1810ء میں کیا گیا اور اس جدوجہد میں ارجنٹائن کے حریت پسندوں نے چلی کی بہت مدد کی، بلکہ ملک کا پہلا صدر بھی ارجنٹائن سے تعلق رکھتا تھا۔ابتدا میں اس ملک کا رقبہ خاصا مختصر تھا مگر 1880ء میں جنگِ بحرالکاہل میں فتح یاب ہو کر پیرو اور بولیویا کا بہت سارا رقبہ چلی کے قبضے میں آ گیا۔جنگ کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا چونکہ اس متعلق ہر ملک کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے جو کہ دشمن ملک سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔کہتے ہیں جنگ میں پہلا قتل سچائی کا ہوتا ہے۔

جغرافیائی اور حیاتیاتی اعتبار سے یہ ملک انتہائی متنوع ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں قائم شعبہ نباتیات سے وابستہ میرے استاد کی ''خواہش مرگ'' تھی کہ کسی طرح وہ چلی پہنچ جائیں۔ یہ لفظیات کی بات نہیں، سائنسی اعتبار سے ایسی متنوع، زمین، آسمان اور حیات دنیا بھر میں کم کم پائی جاتی ہے جیسی اس خطے میں ہے۔ فطرت کی یہ رنگا رنگی اور تنوع ہی وہ سبب ہے کہ یہاں ایسے شاعر، ادیب اور فنکار پیدا ہوتے ہیں جن کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ اس وقت ہسپانوی زبان میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی مصنفہ اور ادیبہ چلی کے سابق انقلابی صدر آیندے کی بھتیجی ازابیل آیندے ہیں۔ یہاں یہ تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ ہسپانوی زبان فقط سپین سے ہی متعلق نہیں رہی ہے، بلکہ اس وقت یہ انگریزی کے بعد دنیا کے سب سے زیادہ ممالک میں بولی جانے والی زبان ہے۔ پچاس کے قریب ممالک کی اس فہرست میں ازابیل آیندے کی اب تک پانچ کروڑ سے زیادہ کتب شائع ہو کر فروخت ہو چکی ہیں۔ امریکی صدر بارک اوباما نے انہیں 2014ء میں تمغہ آزادی دیا۔ ازابیل آیندے بیس سے زائد ناول لکھ چکی ہیں اور کئی دیگر کتب بھی انہوں نے تحریر کی ہیں۔ یاد رہے کہ ازابیل آیندے کے چچا سلوادور آیندے کا تختہ الٹنے میں امریکی سی آئی اے اور اس کے F16 طیاروں نے باقاعدہ حصہ لیا تھا۔ آیندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر صدر بنا تھا، مگر وہ سرد جنگ کا زمانہ تھا اور امریکہ دائیں بازو کی ہر فوجی بغاوت کا حامی تھا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی نے صدارتی امیدوار کے لئے پابلو نرودا کو چنا تھا مگر وہ اپنے دیرینہ دوست آیندے کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ آیندے خود بھی ایک ترقی پسند مصنف تھا، پابلو نرودا اس کی حکومتی کابینہ کا حصہ تھا۔ عہد حاضر کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالیں تو ایک دلچسپ پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ چلی کے دس مقبول ترین مصنفین میں سے آٹھ خواتین ہیں۔

# فٹ بال کا قدیم ترین ٹورنامنٹ

سان تیاگو کے ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی کوپا امریکہ 2015 کے رنگا رنگ خیر مقدمی بینروں نے استقبال کیا۔ٹورنامنٹ میں حصہ لینے والی بارہ ٹیموں کے قومی پرچم جگہ جگہ آویزاں تھے۔اور فٹ بال کے جنوبی امریکی کھلاڑیوں کی تصاویر کے پوسٹر تمام شہر میں نمایاں مقامات پر دیکھے جا سکتے تھے۔لوکل فلائیٹ کے لیے مقامی ایئر لائن کے جہاز پر سوار ہوا تو ہر سیٹ کے سرہانے سفید سیٹ پوش پر دنیا بھر سے آنے والے فٹبال کے شائقین کے لیے جلی آمد پر خوش آمدید کا پیغام لکھا تھا۔فٹ بال کی تاریخ کے اس پہلے ٹورنامنٹ کی ابتداء 1916ء میں ہوئی تھی۔ارجنٹائن جنوبی امریکہ کے ممالک کے مابین ہونے والے اس پہلے عالمی مقابلے کا میزبان بھی تھا اور فاتح بھی۔کوپا امریکا جسے اب امریکن کپ بھی کہا جاتا ہے، اپنی ابتدا کے بعد ہر سال منعقد ہوتا تھا اور اس کا مقبول نام ''جنوبی امریکی کپ'' تھا۔اب یہ ٹورنامنٹ دنیا میں سب سے زیادہ دیکھے جانے والے کھیل کے مقابلوں میں

سے ایک ہے۔ٹورنامنٹ کے ابتداء سے لیکر انتہا تک پورا مہینہ میں چلی میں رہا جو کہ ان فٹ بال مقابلوں کا فاتح اور میزبان تھا۔

کوپا امریکہ جیتنے کے لیے چلی کو 99 برس انتظار کرنا پڑا۔ 2015 کے مقابلوں سے پیشتر چلی چار مرتبہ فائنل میں پہنچا تھا مگر کبھی بھی فتح اس کا مقدر نہ بن سکی تھی۔ چلی کے لئے ایک صدی پر محیط یہ انتظار اس وقت ختم ہوا جب جنوبی امریکہ میں فٹ بال کے بانی ملک ارجنٹائن نے فائنل مقابلے میں اپنی پنلٹی شوٹ پر گول کرنے میں ناکامی کا سامنا کیا اور چلی کے کھلاڑی کامران رہے۔

لاطینی امریکہ میں پہلے فٹ بال میچ کی تاریخ 1867ء میں ارجنٹائن میں کام کرنے والے برطانوی نژاد ریلوے اہلکاروں کے درمیان ملتی ہے۔ پہلی ٹیم بھی امریکی براعظموں میں ارجنٹائن نے ہی تشکیل دی تھی۔ یہ انیسویں صدی کے آخری سالوں کا واقعہ ہے۔فٹ بال کا پہلا عالمی مقابلہ بھی 1910ء میں ارجنٹائن نے ہی منعقد کروایا مگر اسے فٹ بال کی عالمی تنظیم کی تائید حاصل نہیں تھی۔ مذکورہ میچ میں یوراگوئے اور چلی کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔بہر حال 1916 میں موجود ''جنوبی امریکی فٹ بال چیمپئن شپ'' کے نام سے اس عالمی مقابلے کی ابتداء ہوئی، جو عالمی سطح پر تسلیم شدہ قدیم ترین ٹورنامنٹ ہے۔ برازیل، یوراگوئے اور چلی شرکت کے لیے ارجنٹائن آئے اور یوراگوئے اس ٹورنامنٹ میں کامیاب وکامران قرار پایا۔سوسال سے جاری اس ٹورنامنٹ کے فائنل مقابلوں میں بارہ ممالک کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں، ان میں سے دس ٹیمیں مستقل جب کہ دو ٹیمیں شمالی امریکی براعظم سے لی جاتی ہیں،عموماً میکسیکو اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ٹیمیں شرکت کا اعزاز حاصل کرتی ہیں۔ یہ ٹورنامنٹ ایک مہینہ جاری رہتا ہے۔اب تک یوراگوئے سب سے کامیاب ٹیم ہے جو کہ پندرہ مرتبہ یہ ٹورنامنٹ جیتی ہے، دفاعی چیمپئن بھی وہی تھی مگر اس

مرتبہ کوارٹر فائنل میں پنلٹی ککس پر ارجنٹائن سے شکست کھا گئی۔ اگر ارجنٹائن کی ٹیم فائنل جیت جاتی تو سب سے زیادہ مرتبہ کوپا امریکہ جیتنے کا یوراگوئے کا ریکارڈ برابر ہوجاتا۔ کوپا امریکہ کے میزبان ممالک کی میزبانی کا فیصلہ بھی بڑے دلچسپ انداز میں ہوتا ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے، دس مستقل ممالک کے نام کا پہلا حرف اور اگر وہ حرف دو ممالک میں مشترک ہے تو پھر ان کا دوسرا حرف، اس طریقے سے جنوبی امریکہ کے تمام ممالک کو لازم طور پر میزبانی کا موقع ملتا ہے۔ وینیز ویلا کے بعد 2011ء میں ''A'' سے ارجنٹائن کی باری آئی، اس طرح چار سال بعد 2015ء کا ٹورنامنٹ تکنیکی طور پر ''بی'' سے برازیل کا حق تھا۔ مگر 2014ء کے فیفا ورلڈ کپ اور پھر 2016 کے برازیل میں منعقد ہونے والے اولمپک مقابلوں کی وجہ سے یہ مقابلہ بھی برازیل میں ہی ہونا غیر مناسب لگ رہا تھا۔ اسی بنیاد پر امریکہ نے 2015ء کے کوپا امریکہ کی میزبانی کی خواہش کا اظہار کیا تھا، جسے اصولی طور پر رد کردیا گیا۔ امریکی اعتراض چونکہ معقول تھا اس لیے آئندہ ٹورنامنٹ کے میزبان چلی اور برازیل نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی سرزمین پر کھیلے جانے والے ٹورنامنٹ کا باہمی تبادلہ کرلیں۔ لہذا اب 2019ء کا کوپا امریکہ ''سی'' سے چلی کی بجائے ''بی'' سے برازیل میں منعقد ہوگا، جبکہ 2015ء کا میزبان چلی بن گیا۔ البتہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بھی ناراض نہیں کیا گیا اور کوپا امریکہ کے اگلے سال منعقد ہونے والے یادگار صد سالہ ٹورنامنٹ 2016ء کی میزبانی اسے دے دی گئی ہے۔

ٹیلی وژن پر 2015ء کے فٹ بال مقابلوں میں اسٹیڈیم کے اندر کے حالات تو آپ نے ملاحظہ فرمائے ہوں گے، کھیل کے میدان سے باہر کے مناظر بھی ناقابل فراموش تھے۔ تمام شہروں کے اہم بازار اور ریستوران کے باہر میچ کی اطلاع اور ٹی وی پر دکھائے جانے کا اہتمام، حکومت کی طرف سے دارالحکومت کے سب سے اہم چوک اور اہم شہروں

میں بڑی بڑی اسکرینیں نصب کی گئی تھی ۔جن پر لائیو میچ دیکھنے کے لیے لوگوں کا جم غفیر موجود تھا۔شائقین کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے ہر سائز کے باجے اور شہر میں تو قومی پرچموں کی بہار آئی ہوئی تھی ۔پرچموں پر مبنی ٹوپیاں ،مفلر اور گاڑیوں پر پرچم ۔سب سے دلچسپ صورت حال یہ تھی کہ اگر آپ کسی وجہ سے میچ نہ دیکھ رہے ہوں تو یکدم گاڑیوں کے ہارن، پٹاخے ،آتش بازی اور لوگوں کا شور بتا دیتا تھا کہ چلی نے گول کر دیا ہے، ہاں !! البتہ خاموشی چھانے سے گمان ہوتا کہ لگتا ہے چلی کو گول ہو گیا ہے۔پورے ملک میں ایک مہینہ گفتگو کا ہر جگہ واحد موضوع فٹ بال اور کوپا امریکہ ہی رہا۔لاطینو لوگ تو عام دنوں میں بھی جشن منانے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں، جب کسی ملک کو کوپا امریکہ کی میزبانی کا موقع مل جائے پھر تو اس دیس کے باشندے ٹورنامنٹ کے دوران کوئی بھی پیداواری کام کرنا گناہ کبیرہ اگر نہیں تو صغیرہ گناہ ضرور سمجھتے ہیں۔
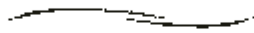
# پابلونرودا کے آنگن میں ایک دوپہر

اس وقت میں پابلونرودا کے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں ۔ یہ مکان نوبیل انعام یافتہ انقلابی شاعر اور سیاستدان نے اپنی محبوبہ کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ اس رہائش گاہ کا نام بھی نرودا نے اسی حسینہ کی گھنی زلفوں کی نسبت سے رکھا تھا، ''**لاچسکونا**'' **گھنگھریالے بالوں والی** یہ خاتون خوش نوا شاعر کی تین بیویوں کے علاوہ تھی ۔میرے قریب بنچ پر برازیل کا ایک نوجوان شاعر بیٹھا ہوا ہے، ابھی ابھی بتا رہا تھا کہ اس کی ذاتی شاعری فرانسیسی اور ہسپانوی زبان کے علاوہ پرتگیزی زبان میں بھی شائع ہوچکی ہے۔پابلونرودا کے آستانے کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ اس گھر کی فضاءمحبت سے معطر ہے، گھر کی ایک ایک اینٹ سے محبت چھلکتی ہے۔ میں نے اپنا تعارف بطور شاعر کروایا تو کہنے لگا کہ یہ کُنجِ عافیت تو دنیا بھر کے شاعروں کے لیے ویٹی کن کا درجہ رکھتا ہے ۔ناہموار پتھریلی پہاڑی کے دامن میں واقع اس مکان کی تعمیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ وہاں پر پہلے سے موجود کوئی ایک درخت بھی نہیں کاٹا

گیا، اور پہاڑی کے فطرتی پیچ وخم کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کم وبیش چار کنال کے رقبے پر پھیلے اس مکان کو بناتے ہوئے جس تعمیری مہارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ فقید المثال ہے۔ یہ گھر قطعی طور پر مہنگا نہیں لگتا، بالکل سادہ، مگر آرٹ کا ایک شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ بڑے بڑے گھر مہنگے تو نظر آتے ہیں۔ مگر خوبصورت کم کم نظر آتے ہیں۔ شاید تعمیر کروانے والے مالکان کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ مکان مہنگا نظر آئے، خوبصورت بھلے نہ ہو۔

اس مکان کی سیر سے پابلو نرودا کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہوتا ہے، اسے فن تعمیر سے بے حد لگاؤ تھا۔ فن تعمیر سے اس کی دلچسپی کا مظہر وہ تین مکان تو ہیں ہی جو اس نے خود ڈیزائن کیے اور اپنی نگرانی میں تین مختلف شہروں میں تعمیر کروائے، ایک اور مکان کا ماڈل اس گھر کی لائبریری، جس کے آنگن میں اس وقت میں براجمان ہوں، پڑا ہوا ہے۔ نرودا اس مکان کو تعمیر کروانا چاہتا تھا مگر وقت نے وفا نہیں کی اور شاعر کا یہ خواب حقیقت کا روپ نہ دھار سکا۔ کیسے دلچسپ پہلو ہیں اس انوکھے گھر کے، جن میں سے ایک یہ پہلو بھی کہ ہر موڈ کے لیے شاعر نے الگ کمرہ بنا رکھا تھا۔ اگر کسی صبح ناسٹلجیا محسوس ہوا تو پھر وہ دن ناسٹلجیا کے لیے مخصوص کمرے میں گزرتا، خوشی اور غمگین موڈ کے لیے کمرے الگ الگ رکھے تھے۔ عین ممکن ہے کہ بعض قارئین کنفیوژن کا شکار ہو جائیں کہ میں نہ جانے دنیا کے کس کونے کا تذکرہ کر رہا ہوں؟ عرض ہے کہ میں اس وقت لاطینی امریکہ کے ملک چلی کے دارالسلطنت سنتیاگو سے آپ سے مخاطب ہوں۔

چلی کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے سرد موسم اور سالم سبز مرچ سے مشتق ہونے سمیت کئی روایات موجود ہیں۔ اس بارے میں سب سے دلچسپ اور قرین قیاس روایت قدیم مقامی قبائل اور انہی کے نام سے منسوب زبان ماپوچو سے ماخذ ہے۔ ماپوچے زبان میں چلی

کا مطلب خشکی کا آخری کنارہ ہے، اسے زمین کا خاتمہ کے طور پر بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔
یہ تاریخی ماپوچے روایت اس لیے بھی دل کو لگتی ہے کہ زیادہ منطقی اور دھرتی سے جڑی ہوئی
ہے۔ اگر دنیا کا نقشہ اٹھائیں تو چلی کی پٹی کے آگے بحرالکاہل اپنی اتھاہ گہرائیوں اور بے پناہ
وسعتوں سے لبریز نظر آتا ہے۔ یہ ملک کئی لحاظ سے منفرد ہے، لاطینی امریکا کا یہ وہ ملک ہے
جس کے باشندوں کی غالب اکثریت نسلی اعتبار سے یورپی نژاد ہے۔ خوبصورتی اس معا
شرے کی مگر یہ ہے کہ نسل پرستانہ رویہ یہاں معدوم ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ
برسوں یہاں سکونت پذیر رہے اور مسلسل رابطے کے باوجود مجھ پر گزشتہ سال یہ حقیقت
آشکار ہوئی کہ ملک کی اکثریتی آبادی یورپی النسل ہے، وہ بھی یوں کہ میں یہاں کے ایک
کرنسی نوٹ پر چھپی ایک فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر اس کی تاریخ ڈھونڈنے نکلا تھا، تحقیق کر
نے پر معلوم ہوا کہ وہ سپاہی دارالحکومت سنتیا گو کا بانی اور معمار پیدرو دی بالدیویا ہے،
موصوف ہسپانوی نژاد ہیں۔ مجھے تھوڑا تعجب ہوا، کیونکہ مقامی لوگ تو کبھی بھی غیر ملکی
نوآبادیاتی حکمرانوں کو اپنا ہیرو تسلیم نہیں کرتے، دنیا کا چاہے کوئی بھی ملک ہو۔ اس کے
ساتھ ہی یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی کہ ملک کی غالب اکثریت ہسپانوی، جرمن، فرانسیسی، و
دیگر یورپی ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔

عالمی تاریخ میں چلی دنیا کا پہلا ملک تھا جہاں آزادی کے حصول کے لیے
ریفرنڈم منعقد ہوا، لوگوں کی واضح اکثریت نے علیحدگی کے حق میں ووٹ ڈالا۔ یہ واقعہ بہت
ہی مزے کا ہے، ہوا یوں تھا کہ فرانسیسی فاتح جرنیل نپولین بوناپارٹ نے سپین فتح کرنے
کے بعد اپنے حقیقی بھائی کو 1808 عیسوی میں ہسپانیہ کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ چونکہ چلی میں غا
لب اکثریت ہسپانوی النسل لوگوں کی تھی اور وہ ہسپانیہ عملداری میں ہی تھا، لہذا فرانسیسی نژاد
نپولین بوناپارٹ کے بھائی کو لوگوں نے اپنا بادشاہ قبول کرنے سے انکار کیا اور ہسپانیہ سے

علیحدگی کا راستہ اختیار کیا، سن 1810 میں عوام نے چلی کی خود مختار حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ آج پونے دو کروڑ آبادی والے اس ملک کا بیس فیصد رقبہ گزشتہ سے پیوستہ صدی کے آخر میں بولیویا اور پیرو سے ہونے والی جنگ کے نتیجے میں چلی نے اپنے قبضے میں لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمال کے رہنے والے لوگ اپنی شکل وصورت سے پیرو اور بولیویا کے باشندے نظر آتے ہیں۔ ایک دفعہ ہماری سیکرٹری کی والدہ ہمارے شوروم پر آئی تو میں نے پوچھ لیا کہ کیا وہ پیرو کی رہنے والی ہے؟ خاتون نے وضاحت کی کہ وہ میری سیکرٹری کی والدہ ہے، بعد ازاں اس خاتون نے اپنی بیٹی کو احتجاج ریکارڈ کروایا۔ سیکرٹری روساسیگو ویا نے پھر وہی احتجاج مجھ تک پہنچایا کہ میں نے اس کی ماں کو پیرو کی باشندہ کہا ہے، جو کہ شاید نسلی اعتبار سے ان کے نزدیک کمتر قومیت ہوگی، خدا گواہ ہے کہ میں نے جو دیکھا وہی کہا تھا۔ تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو میں نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔

یوں تو پابلو نرودا کے سنتیا گو میں واقع جس گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں وہ مرجع خلائق ہے مگر ازلا نیگرا والے مکان کی اہمیت زیادہ ہے۔ اول وجہ تو یہ ہے کہ نرودا اور اسکی بیوی متیلدے اس گھر کے آنگن میں مدفون ہیں، دوم، نرودا کی دنیا بھر کی سیاحت اور کئی ملکوں میں سفارتکاری کے دوران اکٹھی ہونیوالی سوغاتیں نشانیاں، عجائبات اور فن پارے، اسی فیصد اس گھر میں موجود ہیں۔ عجیب وغریب اشیاء اکٹھی کرنے کا پابلو نرودا کو بہت شوق تھا، بلکہ جنون کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ گھر کا فرنیچر ایسا ہے کہ کوئی چیز دوسری سے نہیں ملتی، ماسوائے ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں کے، وہ بھی آپس میں تو ضرور ملتی ہیں مگر دنیا میں ایسی عجیب کرسیاں کم ازکم میں نے تو اور کہیں نہیں دیکھی ہیں۔ تینوں گھروں میں دو، دو مے خانے ہیں، جن میں رنگین گلاس اور جام رکھے ہیں، پیلے، سبز، نیلے، سرخ، شاعر کا عقیدہ تھا کہ جام کا رنگ بدلنے سے مشروب کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔

نرودا کے گھروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے سمندر سے خصوصی لگاؤ تھا۔ پابلو نرودا فاؤنڈیشن جو اس کے نام سے منسوب ہے، اس کے تینوں گھروں کا انتظام چلاتی ہے، جو کہ اب میوزیم بنا دیے گئے ہیں، اس کی کتابوں کی اشاعت کے اہتمام کے علاوہ دیگر تقاریب ومنصوبہ جات کی دیکھ بھال کرتی ہے، اس فاؤنڈیشن کا مونوگرام مچھلی ہے۔ ازلا نیگرا والا گھر ساحل سمندر پر واقع ہے، گھر کے اوپر ایک کشتی بنی ہوئی ہے جہاں سے کھلا سمندر نظر آتا ہے، اپنے قیام کے دوران بلاناغہ اس کشتی میں بیٹھ کر نرودا کئی گھنٹے ساگر تکتا رہتا، شراب پیتا اور شعر گوئی کرتا، عہد ساز شاعر اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ملک کی صدارت کے منتخب امیدوار، عاشق مزاج فنکار کا کہنا تھا کہ ایک خاص وقت کے بعد اس کشتی میں بیٹھے ہوئے وہ خود کو سمندری سطح پر سفر کرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لاچسکونا میں بھی ایک بحری جہاز کا ماڈل گھر کا اہم حصہ ہے، گائیڈ کے بقول نرودا اکثر اس بحری جہاز میں بنے کپتان کے کیبن میں سوچا تا تھا۔ سیاسی جلاوطنی کے دوران اٹلی کے جزیرے کیپری پر نرودا کا قیام رہا، وہاں پر بھی سمندر کے ساحل پر ہی رہائش اختیار کیے رکھی۔ اس قیام کے متعلق اطالوی زبان میں ایک ایوارڈ یافتہ فیچر فلم بھی بنی ہے جس کا نام ''IL POSTINO'' ہے۔ جلاوطنی کے دوران جوڑا کیا اس کو ڈاک لا کر دیتا تھا نرودا کی اس کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ چلی واپسی کے بعد نرودا نے اس ڈاکیے سے فرمائش کی تھی کہ وہ کیپری کے ساحل سمندر کی لہروں کی آواز ریکارڈ کر کے اس کو بھیجے، جس کی مذکورہ ڈاکیے نے تعمیل بھی کی تھی۔ جس شخص کو ادب کے نوبیل انعام یافتہ لوگ بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں سب سے بڑا شاعر مانیں اور جس کی نظم ''ماچو پیچو کی بلندیاں'' کو میسا چیوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سربراہ ''انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم'' قرار دیں وہ شاعر عام زندگی میں بھی عام لوگوں سے اتنا سا تو مختلف ہو گا ہی۔

پابلو نرودا کے گھر جاتے ہوئے ایک گلی کا موڑ مڑا تو سڑک کا نام کنداں تھا، 21 مئی لاطینی امریکہ کے ممالک میں اہم تواریخ کے نام پر سڑکوں اور گلی محلوں کے نام رکھے جانے کا رواج بہت مقبول ہے۔ 5 اگست، 11 ستمبر، 16 نومبر، 25 دسمبر، یکم جنوری، یہ سب یقیناً تاریخیں ہیں مگر چلی کے ہر دوسرے شہر میں یہ سڑکوں کے نام بھی ہیں۔ پچھلی مرتبہ اس گھر کی سیر ہمیں گائیڈ لڑکی آنخلا نے کروائی تھی، مگر اس بار استقبالیے پر ہمیں برقی ہیڈ فون تھما دیے گئے، جن سے آپ اپنی پسندیدہ زبان میں، اس گھر کی تاریخ اور نرودا کی زندگی سے اسے نسبت کے بارے میں تمام اہم معلومات و تفاصیل سن سکتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوگا اگر ہماری حکومت اہم قومی ہیروز کے مکانات خرید کر ان کو اسی طرز پر عجائب گھروں میں تبدیل کر دے۔ اس سلسلے میں فیض گھر ایک قابل تقلید مثال ہے۔ فیض احمد فیض کے اہل خانہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انقلاب و رومان کے عظیم شاعر کے ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع قیمتی مکان کو رضا کارانہ طور پر ایک عوامی مقام میں تبدیل کر دیا ہے۔
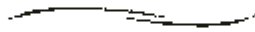
# لاس پیر دیس

طویل قطاروں میں کھڑے ہوئے لوگوں میں کوئی بے چینی نظر نہیں آتی۔سب لوگ صبر وتحمل سے اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔دھکم پیل تو دور کی بات ہے قطار میں منتظر کسی چہرے پر بے زاری اور عجلت کے آثار تک نظر نہیں آتے۔میکسیکو شہر میں مجھے تو سب سے زیادہ اس بات نے متاثر کیا۔پولیس نفری کی غیر معمولی تعداد اور مسلسل گشت شہریوں کو تحفظ کا احساس دلاتے ہیں جو کہ قابلِ تعریف امر ہے۔سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر ٹورسٹ بس کی چھت پر بیٹھے،گردوپیش کے مناظر کا جائزہ لیتے ہوئے،اپنے ساتھ والی نشست پر بیٹھی شکاگو سے آئی ہوئی بڑھیا سے میں نے پوچھا کہ اس شہر کی کون سی چیز تمہیں سب سے زیادہ پسند آئی ہے؟بڑھیا کا جواب تھا کہ اس شہر کے در ودیوار کے رنگ۔یہ شہر رنگوں میں بہت امیر ہے۔ہاں!! ہاں!! امریکی خاتون کا مشاہدہ اور بیان مبنی بر حقیقت ہے۔واقعی مکانوں،دکانوں اور دیگر عمارات کے جتنے متنوع رنگ اس شہر میں نظر آتے

ہیں، وہ شاید دنیا کے کسی بھی اور نگر کے درودیوار پر نظر نہیں آئیں گے۔ کم از کم جتنے مما لک کی میں نے سیر کی ہے، ان میں سے کوئی بھی شہر اتنا رنگین مزاج نہیں رکھتا، جیسا شوخ اور رنگین مزاج اس شہر میکسیکو کی درودیوار کا منظر پیش کرتا ہے۔

مذکورہ بڑھیا کی اس بات سے میں بہر حال متفق نہیں ہوں کہ شکاگو دنیا کا سب سے اچھا شہر ہے۔ امریکی خاتون کے دلائل اپنی جگہ مگر یہ دعویٰ میں اس سے پہلے کم وبیش پندرہ مختلف ملکوں کے شہروں کے بارے میں سن چکا ہوں۔ شکاگو کا موسم اچھا ہے اور عام آدمی کو دستیاب سہولیات کے اعتبار سے بھی یہ متاثر کن ہے مگر یہ سب دنیا کے تمام بڑے شہروں میں لگ بھگ ہوتا ہی ہے۔ بڑے بڑے شہروں کی بڑی بڑی باتیں تو ہم کرتے اور سنتے رہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہمارے اس کرۂ ارض پر واقع مجموعی انسانی آبادیوں کا غالب حصہ تو وہ چھوٹی چھوٹی بستیاں اور گاؤں ہیں، جن کا ذکر بہت کم ہوتا ہے۔ ایک ایسی ہی دورافتادہ بستی لاس ہیردیس ہے، جس کا آج میں آپ سے تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

بحر الکاہل کے کنارے پر واقع اس بستی میں دوپہر کی دھوپ میں کھڑے ہوکر اردگرد کے منظر کا جائزہ لیں تو ایک طرف سمندر، دوسری طرف مٹیلے پہاڑ اور درمیان میں ناہموار چٹانوں سمیت ہر چیز سبز نظر آتی ہے۔ یقیناً یہ منظر ہمیشہ سے ایسا ہی سبز ہوگا؟ جبھی تو اس بستی کو بسانے والے مچھیروں نے اس علاقے کا نام ’’لاس ہیردیس‘‘ ہسپانوی نام کو اردو میں کہیں تو ’’سراپا سبز بستی‘‘ رکھ دیا۔ ماحول کی رنگت سے منسوب یہ بستی اتنی چھوٹی ہے اگر آپ نقشہ دیکھیں تو شاید اس کا نشان ہی نہ ملے۔ مگر نقشے میں کسی مقام کے عدم دستیاب ہونے سے اس کا وجود تو ختم نہیں ہوجاتا، اور نہ ہی اس سبب سے اسکی اہمیت کم ہوسکتی ہے۔ میرے لئے تو ایسے مقامات میں دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی

ہے۔ جن کا کہیں احوال ہی درج نہ ہو۔ چلی کی ریاست کا مجموعی رقبہ پندرہ ریجن میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آپ انہیں پندرہ صوبے کہہ لیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ بستی پہلے ریجن میں واقع ہے جسے ''تاراپاکا'' کہا جاتا ہے۔ یہ ملک کا شمالی علاقہ ہے۔ یہاں موسم سارا سال معتدل رہتا ہے۔ گرمی زیادہ پڑتی ہے اور نہ ہی زیادہ سردی ہوتی ہے۔

لاس پیردیس کا تعارف اگر آپ سے یوں کرواؤں تو آپ ضرور دلچسپی لیں گے کہ یہاں کتوں کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ دنیا تو بہت بڑی ہے، ہوسکتا ہے یہ دعویٰ باطل ہی ہو؟ مگر میں نے تو اس سے پہلے زندگی میں کبھی کورستان کلاب دیکھا ہی نہیں تھا، جو سنا تھا، وہ آپ سے عرض کردیا ہے۔ کئی ایکڑ پر پھیلا یہ منفرد نوعیت کا گورستان اس لئے بھی اچنبھے کا باعث ہے کہ آس پاس کی آبادی تو چند گھروں پر مشتمل ہے۔ قبرستان کی رونق یقیناً وہ پالتو کتے ہیں جو قریبی بستیوں اور شہروں میں اپنی زندگی گزار کے آئے ہیں۔ لاس پیردیس میں میری آمدورفت کی وجہ قدرتی مناظر کے علاوہ اس کے ریستوران ہیں۔ ان شہرہ آفاق ریستورانوں میں تازہ سمندری خوراک (سی فوڈ کا یہی اردو ترجمہ سمجھ میں آتا ہے) شام ڈھلے تک گاہکوں کو ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوتی ہے۔ سارا دن یہاں دور دراز کا سفر کرنے والے لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مگر اصل ہجوم یہاں چھٹی کے روز ہوتا ہے۔ سمندری مخلوق کے تناول ماحضر کے ساتھ لائیو میوزک پرفارمنس اور لائیو روایتی فوک رقص کھانے کا مزا دوبالا کئے دیتے ہیں۔ سرائے نما ان ریستورانوں کے پہلو میں سیاحوں کے شوقِ سواری کے لئے پست قد کے گھوڑے جنہیں ''پونی'' کہا جاتا ہے۔ کرائے پر ملتے ہیں۔ میرے ساتھ سواری کا تجربہ عجیب رنگ سے پیش آیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ اس ٹیڈی گھوڑے کی پیٹھ پر جب میں سوار ہوا تو پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے وقت یہ بڑا آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ اور خاصا شریف النفس جانور لگ رہا

تھا۔ مگر جونہی واپسی اترائی کا سفر اختیار کیا، اس بدمعاش ٹیڈی گھوڑے نے وہ سپیڈ پکڑی کہ مجھے محسوس ہوا کہ اب یہ بحرالکاہل میں ڈبونے کے بعد ہی سانس لے گا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی باگیں کھینچیں مگر وہ دیوانہ وار سمندر کی طرف منہ کر کے سرپٹ دوڑتا ہی چلا جاتا تھا۔ دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ سمندر میں ڈوب کر مرنے سے بہتر ہے کہ بھاگتے گھوڑے سے چھلانگ لگا کر ایک آدھ ہڈی پسلی تڑوا کر ہی جان بخشی کروالی جائے۔ میں اپنے خیالات کو عملی شکل دینا ہی چاہتا تھا کہ ٹیڈی گھوڑا معجزانہ طور پر اپنی رفتار کم کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔

لاطینی امریکہ کے تمام ممالک میں سڑک کنارے ایک منظر مشترک نظر آتا ہے، جو کہ اس بستی کی سڑک کنارے بھی نظر آئے گا، وہ ٹریفک حادثات میں جاں بحق ہونے والے لوگوں کی جائے وفات کے قریب تعمیر کردہ یادگاریں۔ عموماً ایک مربع میٹر رقبے پر کنکریٹ سے بنی یہ یادگاریں دو، چار فٹ اونچی ہوتی ہے۔ ڈربہ نما اس یادگار کے اندر کبھی مرحوم کی تصویر اور اس کی پسند کی کچھ اشیاء، کہیں حضرت عیسیٰؑ اور کنواری مریم کے مجسمے یا پھر دیگر مذہبی تبرکات اس کے اندر رکھے گئے ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی یادگاروں پر لکھی عبارت یکساں ہوتی ہے۔ صلیب پر کندہ ''یسوع'' جانتا ہے''یسوع مسیح'' کے متعلق ہی عموماً دیگر کلمات بھی درج ہوتے ہیں۔

یہ بھی ایک دلچسپ پہلو ہے کہ پچھلے تین سو سال سے اس بستی میں بارش نہیں برسی ہے۔ عین ممکن ہے کہ کبھی نہ کبھی یہاں برکھا برسی ہو مگر تین صدیوں سے پرانا ریکارڈ محکمہ موسمیات کے پاس دستیاب نہیں ہے۔ بارش نہ برسنے کی وجہ کسی دیوتا کی بد دعا یا بستی کے گنہگار لوگ نہیں ہیں بلکہ اس علاقے کا محلِ وقوع اس کا ذمہ دار ہے، پہاڑوں کے سبز سینے سے پھوٹنے والے زیرِ زمین سب چشمے لاس بیر دلیس میں اکٹھے ہوتے ہیں اور یہاں

بحر الکاہل میں جا ملتے ہیں۔ ان رواں دواں چشموں کا میٹھا پانی بارش کی کمی ہرگز محسوس نہیں ہونے دیتا۔ نباتات کا اس بستی میں وجود نہیں پھر بھی ہر طرف سب کچھ سبز ہی سبز نظر آتا ہے، یہ بھی فطرت کا ایک معجزہ ہے۔
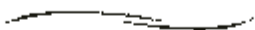
# لاطینی امریکہ کی پہلی نوبیل انعام یافتہ

دنیا کے کسی بھی ملک میں داخل ہوں تو امیگریشن اور کسٹم کے بعد پہلا مرحلہ عموماً کرنسی کو مقامی سکہ رائج الوقت میں تبدیل کروانا ہوتا ہے۔ چلی میں جب مقامی کرنسی ''پیسو'' حاصل کریں تو ہر زخ کے نوٹ پر کسی قومی ہیرو مرد کی تصویر ہی نظر آتی ہے البتہ پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ پر ایک مہربان خاتون کا چہرہ نظر آتا ہے۔ یہ نوبیل انعام یافتہ شاعرہ، سفارتکار اور ماہرِ تعلیم گبریلا مسترال ہیں۔ ہسپانوی زبان کی شاعری کو گبریلا مسترال نے ایک نیا نسوانی لہجہ عطا کیا۔ وہ اگرچہ عالمی سطح پر بطور ماہرِ تعلیم اور سفارتکار کے طور پر پہچانی جاتی تھیں، اسی حیثیت سے انہوں نے متعدد بار لیگ آف نیشنز سے بھی خطاب کیا مگر ہسپانوی ادب میں وہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، ایک ایسی آواز جو ادبی دنیا میں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہے اور پھر صدیوں تک یاد رکھی جاتی ہے۔

گبریلا مسترال لاطینی امریکہ کی پہلی شخصیت تھی جسے ادب کے نوبیل انعام سے

نوازا گیا۔ وہ ان خوش نصیب تخلیق کاروں میں سے ایک ہیں جن کے فن کا اعتراف ان کی زندگی میں بھی کیا گیا، اورمرنے کے بعد بھی انہیں فراموش نہیں کیا گیا۔چلی میں 1884 میں پیدا ہونے والی گبریلا مسترال کی شخصیت کے کئی پہلو غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ اس کے والدین نے پیدائش کے وقت جو اسے نام دیا وہ لوسیاوی ماریا تھا، مگر اس نے اپنے دو پسندیدہ شاعروں کے نام کے اشتراک سے اپنا قلمی نام اخذ کرلیا تھا۔بعض مورخین کے نزدیک نام بدلنے کی وجہ اس کے محبوب کی خودکشی کا واقعہ ہے۔ اسی سبب سے جہاں مسترال کے ہاں قدرتی مناظر، محبت، بے وفائی، نسوانیت اور شفقت مادر کے موضوعات ہمیں ملتے ہیں۔ وہاں اس کے محبوب کی خودکشی کا واقعہ بھی جا بجا اثر انداز ہوتا اور شعروں میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی زندگی ابتداء سے ہی دکھوں اور مصیبتوں میں گھری ہوئی تھی۔فقط تین برس کی تھی جب والد کا انتقال ہوگیا۔ بڑی بہن نے پرورش کی ذمہ داری سنبھالی، مگر کچھ سالوں بعد وہ بھی زندگی کی بازی ہار گئی۔ ماں بیمار رہتی تھی۔ گبریلا فقط پندرہ برس کی تھی جب وہ گھر کی واحد کفیل بن گئی۔ اپنی بیمار ماں کی تیمارداری کے علاوہ وہ سکول میں پڑھاتی بھی تھی۔ مالی پریشانیوں کے سبب اس نے اپنی ذاتی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی چونکہ اس کے والد اور بڑی بہن تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے، اسی لیے کم تعلیم کے باوجود اسے معلّمہ کی نوکری مل گئی۔ ویسے بھی ایک صدی پہلے کے چلی میں تربیت یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ کی شدید کمی تھی۔ مضافاتی علاقوں میں یہ کمی شدید تر تھی لہٰذا جو بھی خواندہ یا نیم خواندہ شخص تدریس کے شعبہ میں دلچسپی ظاہر کرتا اسے کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جایا کرتی تھی۔تعلیم کے شعبہ سے وابستہ ہوکر وہ شہروں شہروں ہجرت کرتی رہی، اس کا سبب اس کی طبیعت میں پائی جانے والی شاعرانہ بے چینی بھی تھی، شوقِ آوارگی بھی۔

پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کی پہلی ملاقات 1920ء میں چلی کے شہر تیموکو میں

اس وقت ہوئی جب نرودا وہاں ہائی سکول کا طالبعلم تھا اور گبریلا مسترال اسے ایک سال پڑھاتی رہی، چونکہ وہ ایک سال کے لیے تدریس کے فرائض سرانجام دینے اس سکول میں متعین تھی۔ اس تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نرودا اور مسترال میں ایک استاد اور شاگرد کا ذاتی نوعیت کا رشتہ موجود تھا، گو کہ دونوں کے شعری نظریات میں اختلاف تھا گبریلا مسترال سیاست سے دور رہنا پسند کرتی تھی، اسی لیے جب اٹلی کے مطلق العنان حکمران مسولینی نے اسے وزارت کی پیشکش کی تو اس نے لگی لپٹی کے بغیر صاف انکار کر دیا تھا۔ شاعری کے میدان میں اسے پہلی کامیابی چلی کے قومی ادب ایوارڈ کی صورت میں 1914ء میں حاصل ہوئی۔ اگرچہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے تک اس نے کئی یادگار نظمیں تخلیق کر ڈالی تھیں اور وہ شائع ہو کر سند قبولیت بھی حاصل کر چکی تھیں، مگر پہلے شعری مجموعے پر ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام ملنا قومی سطح پر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ عالمی سطح پر گبریلا مسترال کا زیادہ موثر تعارف اس وقت ہوا جب نیویارک سے 1922ء میں اس کا شعری مجموعہ ''تنہائی'' اشاعت پذیر ہوا۔ اسی برس وہ میکسیکو کی حکومت کی دعوت پر وہاں تعلیم کے شعبے میں خدمات سرانجام دینے چلی گئی۔ سفارت اور تعلیم کے شعبوں میں خدمات کے سلسلے میں وہ امریکہ اور یورپ اکثر جاتی رہتی۔ چلی سے ترک وطن کے بعد اس کی زیادہ تر زندگی خود ساختہ جلاوطنی میں گزر گئی۔ کئی سال تک وہ فرانس میں بھی مقیم رہی۔ کئی برس بعد چلی لوٹی تو سب سے بڑی یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا حالانکہ وہ بارہ سال کی تھی جب روایتی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ گبریلا مسترال کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ اپنی کئی کتابوں کی کمائی اس نے جنگ سے متاثرہ بچوں کے لیے عطیہ کر دی تھی۔ بچوں سے اس کی محبت اور مادری شفقت اس کی شاعری سے بھی چھلکتی ہے۔

1957ء میں امریکہ کے ایک شہر میں اپنی آخری سانسیں لینے والی اس عظیم نوبل

انعام یافتہ شاعرہ کی اسی بابت ایک نظم پیش خدمت ہے۔ ''اس کا نام آج ہے'' ہم بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے ذمہ دار ہیں مگر ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے بچوں کو نظر انداز کر رکھا ہے، زندگی کے چشمے کو بھلا رکھا ہے، بہت سی چیزیں جن کی ہمیں ضرورت ہے، انتظار کر سکتی ہیں مگر بچے انتظار نہیں کر سکتے۔ یہی وقت ہے جب اس کی ہڈیاں بن رہی ہوتی ہیں، اس کا خون بن رہا ہوتا ہے اور اس کے حواس خمسہ تشکیل پا رہے ہوتے ہیں، اس کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ''کل'' کیونکہ اس کا نام ''آج'' ہے۔

گبریلا مسترال آزادی اور تہذیب کا حصول تعلیم اور خدمت کے ذریعے ہی ممکن سمجھتی تھی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی بھر آزادی اور تہذیب کی ترقی کے لیے تعلیم دینے اور انسانی خدمت کرنے کو ایک روحانی فریضہ سمجھتے ہوئے انجام دیا۔ اس کا خیال تھا کہ دوسرا راستہ حیوانیت اور جنگل کی طرف انسان کو واپس لے جاتا ہے۔ انسانی جذبات کے خوبصورت اظہار کے ساتھ ساتھ لاطینی امریکہ اور یورپ کی تہذیب کے حسین امتزاج سے شعری روایت قائم کرنے والی گبریلا مسترال 67 برس کی عمر میں کینسر میں مبتلا ہو کر دنیا چھوڑ گئیں۔
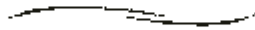
# محبت کے خطوط

میکسیکوشہر کا ثقافتی وسیاحتی مرکز ''پلا سادی آرٹیس'' کہلاتا ہے۔فنونِ لطیفہ چوک ،جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے، یہ عجائب گھروں اورقدیم طرزِتعمیر کی مظہر عمارتوں کا گڑھ ہے۔مربع شکل کے اس وسیع وعریض چوک کے درمیان میں کافی بڑا ساپارک ہے،اس کے اردگرد ہر وقت لوگوں کی چہل پہل رہتی ہے۔خوانچہ فروش اپنی اپنی مصنوعات بیچنے میں سرگرداں رہتے ہیں،قانونی طور پر اس جگہ کاروبار کرنا ممنوع ہے،اسی لئے سارادن ان خوانچہ فروشوں کے ساتھ پولیس کی آنکھ مچولی چلتی رہتی ہے،جب میں چوک میں پہنچاتوپولیس آپریشن جاری تھا اور چھابہ وخوانچہ لگانے والے ادھراُدھر بھاگ رہے تھے۔جو بچ گئے تھے پولیس انہیں اٹھارہی تھی۔چوک میں لوگوں کے ستانے کے لئے بنچ دھرے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک بنچ پر''محبت نامے'' کا پوسٹر لگائے ایک لڑکی اپنی جھولی میں ٹائپ رکھے ہوئے بیٹھی چٹھیاں لکھ رہی تھی۔اس کے اردگردلوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی،اور پولیس والوں کے ساتھ اس کی کسی بات پر بحث بھی ہورہی تھی۔مجمع پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور میں بھی چسکا لینے کے لئے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔پولیس والے اس لڑکی کو

وہاں سے اٹھانا چاہتے تھے، جبکہ مذکورہ مکتوب نویس کے حق میں دو لڑکیاں تند و تیز دلائل دے رہی تھیں۔ ان کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ خاتون اپنا قانونی حق استعمال کر رہی ہے، یہ تو آزادیء اظہار اور بنیادی انسانی حقوق کا معاملہ ہے، یہاں بیٹھنے کا حق اسے اس ملک کا قانون دیتا ہے، پولیس اسے یہاں سے زبردستی نہیں ہٹا سکتی۔ محبت کے خطوط لکھنے والی دوشیزہ کا کہنا تھا کہ میں تو مفت میں لوگوں کو خط لکھ کر دے رہی ہوں، یہ کوئی کاروبار تو ہے ہی نہیں، اس لئے آپ مجھے یہاں سے نہیں اٹھا سکتے۔ خیر پولیس نے ہار مان لی اور وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔ لوگوں نے اسے اپنی فتح سمجھتے ہوئے تالیاں بجائیں۔

میں یہ سوچ کر وہاں سے آگے چل نکلا کہ یہ بنیادی طور پر تو عرضی نویس ٹائپ کوئی خاتون ہے مگر پولیس سے بچنے کے لئے جھوٹ موٹ کہہ رہی ہے کہ وہ مفت میں پیار بھرے خط لکھ کر لوگوں کی سیوا کر رہی ہے۔ پارک کا چکر لگانے اور ہسپانوی و فرانسیسی طرز تعمیر کی عمارات کا مشاہدہ کرنے کے بعد میں فنونِ لطیفہ محل میں داخل ہوگیا، جو کہ اس چوک کی سب سے اہم عمارت ہے، فنونِ لطیفہ محل کی یوں تو کئی چیزیں قابلِ بیان ہیں مگر مجھے سب سے زیادہ دلچسپی گزشتہ صدی کے مشہور کمیونسٹ فنکار جوڑے، عہد ساز مصورہ فرید اور اسکے نامور شوہر ڈیگو راویرا کے فن پاروں میں تھی۔ دونوں کیا باغ و بہار شخصیات تھیں جو عالمی سطح پر میکسیکو کی پہچان بنیں، بیسویں صدی کے فن کی داستان ان کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے، اس جوڑے نے اس وقت سوویت سوشلسٹ انقلاب کے روحِ رواں لیون ٹراٹسکی کی میزبانی کی جب اسے جوزف اسٹالن نے روس سے جلا وطن کر دیا تھا۔ اسی جلا وطنی کے دوران وہ میکسیکو میں ہی قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کا الزام اسٹالن کے علاوہ امریکی سی آئی اے نے عہد ساز ادیب اور شاعر پابلو نرودا کے سر دھرا تھا، حقائق کا تجزیہ کریں تو میرے خیال میں یہ الزامات جھوٹے اور من گھڑت تھے۔ ڈیگو راویرا کے فن پارے نیویارک کے راک

فیلر سنٹر سے اس وقت ہٹادیئے گئے تھے جب اس نے بالشویک انقلاب کے بانی ولادیمر لینن کی مشہورِ زمانہ پینٹنگ بنائی تھی۔فن کدے سے باہر نکلا تو ایک بار پھر محبت نامے لکھنے والی لڑکی کی جانب چل دیا، کہ دیکھوں تو سہی اس مفت خدمت کے ڈھونگ کی حقیقت کیا ہے، معاملے کی اصل نوعیت کیا ہے؟

پریم پتر لکھنے والی خاتون سے جا کر میں نے سیدھا سوال کیا کہ وہ خط لکھنے کے کتنے پیسے وصول کرے گی؟ دوشیزہ نے مجھے یہ کہہ کر حیرت میں مبتلا کر دیا کہ ''بالکل مفت''!! تمہیں بس اپنے پیار کی کہانی مجھے سنانی ہوگی!! خط لکھنے کا میں کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتی ہوں۔ یہ سن کر میں اس کے پاس رکھے بنچ پر بیٹھ گیا۔ سیاں جی کے نام چٹھی لکھوانے کے لئے نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد اپنی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ رسمی تعارف ہوا تو اس نے اپنا نام ملیریا بتایا، میں نے کہا!! ملیریا تو ہمارے ہاں ایک موذی مرض ہے، یہ کیسا نام رکھ دیا تمہارے والدین نے تمہارا؟ اس پر وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی، اور کہنے لگی یہ ''مالے ریا'' ہے!! ملیریا تو یہاں بھی ایک بیماری ہی ہے۔خجالت مٹانے کے لئے میں نے کہہ دیا کہ میں مذاق کر رہا تھا، جس پر سبھی لوگ ہنس پڑے۔پولیس کے ساتھ بحث کرنے والی دیگر دونوں لڑکیاں پیشے کے اعتبار سے وکیل تھیں، انتظار کی قطار میں بیٹھے دیگر عاشقان کی طرح وہ بھی محبت میں مبتلا اور اس سے مفت پیار کا خط لکھوانے کے لئے یہاں براجمان تھیں۔ انہی نے مجھے یہ آگاہی بخشی کہ میکسیکو کی پولیس دنیا میں سب سے زیادہ کرپٹ ہے، جو کہ میرے خیال میں مبالغہ آرائی ہے، یہی دعویٰ پنجاب پولیس کے بارے میں بھی کیا جاتا ہے۔

نامہ نویس خاتون سے میں نے کہا کہ ملکوں ملکوں گھوم چکا ہوں مگر ایسا تجربہ کبھی کہیں نہیں ہوا، محبت نامے تحریر کرنے کا ایسا اچھوتا خیال کیونکر آیا؟ جواب بہت ہی دلچسپ

تھا، بتانے لگی کہ میں سنتی رہتی تھی کہ اس شہر سے سچی محبت اب ختم ہوگئی ہے، مادہ پرستی کا دوردورہ ہے، لوگ عاشقی بھول گئے ہیں، پیار اب ماضی کا قصہ ہوگیا ہے۔ میں ادب کی طالب علم رہی ہوں اور چھوٹی موٹی مصنف بھی ہوں، میں محبت کی ترویج کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ میرے پاس یہ پرانا ٹائپ رائٹر پڑا تھا، دیکھنے میں چھوٹا سا ہے لیکن بڑے خاصے کی چیز ہے، اس جیسے کلاسیکی ٹائپ رائیٹر دنیا بھر میں صرف پچاس باقی بچے ہیں۔ بس میں نے عشق اور اہلِ عشق کے لئے ٹائپ رائیٹر سنبھالا اور یہاں آ کر بیٹھ گئی، میں پریمیوں سے ان کی پریم کتھا سنتی ہوں اور پھر اپنے الفاظ میں اسے ایک ادبی رنگ سے تحریر کر کے محبت نامے کا روپ دیتی ہوں، جو اہلِ دل اپنے محبوب یا محبوبہ کے نام لکھواتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ صدقہ جاریہ ہے۔ میں نے پوچھا!! بھلی مانس! اس کام کا کوئی محنتانہ تو تم وصول نہیں کرتی، پھر کھاتی پیتی کہاں سے ہو تم؟ کہنے لگی ان مکاتیب عشق کی تحریر کے لئے میں نے بدھ کا دن مخصوص کر رکھا ہے، باقی دنوں میں دنیاداری کرتی رہتی ہوں۔

دنیا کے دیگر ممالک میں بیٹھ کر آپکو یہ باتیں عجیب اور شاید کہانی سی لگے، مگر لاطینی امریکہ ایسا ہی ہے، محبت کے رنگ میں کوڑھا رنگا ہوا، موسیقی میں ڈوبا، رقص میں مبتلا اور آرٹ کا دل دادہ۔ یہ ملک بارہ کروڑ نفوس پر مشتمل، آبادی کے اعتبار سے گیارھویں اور رقبے کے اعتبار سے اقوام عالم میں چودھویں نمبر پر کھڑا ہے، گولڈ مین ساچے کے مطابق سن 2050ء تک، میکسیکو دنیا کی پانچویں بڑی معاشی قوت بن کر ابھرے گا۔ بین الاقوامی سطح پر معیشت کا مسابقتی تجزیہ یقیناً درست ہی ہوگا، مگر یہاں آ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور ہی دنیا کوئی اور ہی سیارہ ہے، باقی عالم سے اس جہان دیگر کا بھلا کیا لینا دینا ہوسکتا ہے۔

# میکسیکو سٹی-قوسِ قزح کے رنگوں سے مزین شہر

چاروں طرف سے بلند و بالا پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک ایسی وادی کا تصور کریں جس کے وسط میں ایک بہت بڑی جھیل ہو، اس جھیل کے مرکز میں کوئی بہت بڑا جزیرہ ہو اور اس جزیرے پر ایک شہر آباد ہو جائے تو کیسا لگے گا؟ میں طلسم ہوشربا کی کہانی کے کسی نگر کا ذکر نہیں کر رہا بلکہ میکسیکو کے دارالخلافہ اور اس کے ہم نام شہر میکسیکو کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ سن 1325 عیسوی میں بسنے والے اس شہر کے اردگرد واقع جھیل تو وقت کے ساتھ ساتھ سوکھ کر ماضی کی داستان بن گئی اور شہر پھیلتا چلا گیا مگر اب بھی شہر کا جغرافیہ اور تعمیر کے زیر و بم اس جھیل کا پتہ دیتے ہیں۔ سولہویں صدی میں جب ہسپانوی فوجوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اسے مکمل طور پر تاراج کر ڈالا، اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بعد ازاں اس شہر کی ہسپانوی طرز پر ازسرِ نو تعمیر ہوئی۔ یہ شہر لاطینی امریکہ میں ہسپانوی سلطنت کا دارالحکومت بنادیا گیا۔ بنیادی طور پر اس شہر کو بسانے والے لوگ میکسیکا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ سپین

کے قبضے میں جانے سے پہلے اس شہر کا نام کچھ اور تھا مگر ہسپانوی حکمرانوں کے لئے یہ تلفظ ذرا مشکل تھا لہٰذا انہوں نے اپنی آسانی کے لئے میکسیکا قبیلے کے لوگوں کی نسبت سے اس شہر کو میکسیکو کا نام دے ڈالا اور پچھلے پانچ سو سال سے یہی رائج چلا آرہا ہے۔

دورانِ پرواز جہاز میں میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھی میکسیکن لڑکی نے مشورہ دیا کہ ایئر پورٹ کے احاطے سے نکلتے ہی ٹیکسی مت لے لینا بلکہ ایئر پورٹ سے ملحقہ سڑک پیدل پار کر کے دوسری جانب ٹیکسی سٹینڈ کا رخ کرنا، وہاں موجود ٹیکسی تمہیں ایک تو دس منٹ پہلے شہر کے مرکز میں پہنچا دے گی، دوسرا تمہارے آدھے پیسے بھی بچ جائیں گے۔اس کا کہنا تھا کہ ایئر پورٹ ٹیکسی والے قصائی ہیں۔مقامی کرنسی کو ''پیسو'' کہتے ہیں جو ایک ڈالر میں تیرہ آجاتے ہیں مگر میں نے سہولت کے لئے انہیں پیسے لکھا ہے۔دو کروڑ آبادی اور دنیا میں سب سے بڑے ہسپانوی زبان بولنے والے شہر پرواز پہنچی تو میں نے مذکورہ خاتون کی ہدایت کے مطابق سڑک کے اس پار ٹیکسی سٹینڈ کا رخ کیا، ابھی چند ہی قدم ایئر پورٹ سے باہر نکلا ہوں گا کہ اتفاق سے جس پرواز سے میں یہاں پہنچا تھا، اسی پرواز کا فضائی میزبان لڑکا مجھے مل گیا۔میں نے تصدیق کے لئے ٹیکسی سٹینڈ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑی بے تکلفی سے مجھے کہا کہ ٹیکسی کو دفع کرو، وہ سامنے کھڑی سرخ میٹرو بس پکڑو اور تین ڈالر، پندرہ منٹ میں قدیم شہر اور محلات کے مرکز میں پہنچ جاؤ۔یاد رہے کہ میکسیکو سٹی کو محلات کا شہر کہا جاتا ہے۔میں نے سکیورٹی کے متعلق اپنے خدشات اور تحفظات کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ ٹیکسی کی نسبت بس زیادہ محفوظ ہے۔ہر بس میں نہ صرف پولیس تعینات ہے بلکہ پولیس کی موبائل گاڑی بھی چھوٹی بڑی سڑک کو محفوظ بنانے پر مامور ہے۔ اس لئے بے فکر ہو کر سوار ہو جاؤ!!!میٹرو بس کے چاروں طرف بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے، میں یہ سوچ کر بس میں سوار ہو گیا کہ ٹیکسی کی نسبت اس میں سے باہر کا منظر زیادہ واضح اور دلکش

نظر آئے گا۔ بس میں واقعی ایک مسلح، باوردی نوجوان براجمان تھا۔ چاک وچوبند تو نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ سواریوں کے ساتھ گپ شپ میں بے حد مصروف تھا۔ بس کے ہر سٹاپ پر پولیس کا ایک مسلح اہلکار موجود تھا۔ کئی جگہ مسلح خواتین پولیس اہلکار ڈیوٹی سرانجام دے رہی تھیں اور سڑک پر پولیس موبائل کا گشت بھی غیر معمولی تھا۔

میکسیکو شہر کا قدیمی مرکز مجھے تو لاہور کے انارکلی بازار کی فوٹو کاپی لگا۔ لوگوں کی گہما گہمی۔ دکانوں کا سائز اور گاہکوں سے بھاؤ تاؤ، عمارتوں کا نوآبادیاتی طرز تعمیر اور شاید لوگوں کی رنگت اور معاشی حالات بھی ان وجوہات میں شامل ہوں جو مل جل کر یہاں بھی ویسی ہی فضا بنا رہی تھیں جو انارکلی بازار کا خاصہ ہیں۔ بازار میں لگی ہوئی ٹف ٹائل اور میٹرو بس جس کا رنگ اور سائز ہی نہیں، نام تک لاہور کی میٹرو بس کا مماثل ہے، اس تاثر کی وجہ ہوسکتا ہے۔ میکسیکن کھانے پاکستانی کھانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ مرچ مصالحے تو ہماری ہانڈی کی مشترک اساس ہیں، مگر کمال یہ ہے کہ یہاں روٹی کھائی جاتی ہے جو سائز میں ذرا ہم سے چھوٹی ہوتی ہے، مگر ذائقہ وہی تازہ گندم اور چولہے کی آنچ پر پکا ہوا۔ سچی بات ہے مجھے تو میکسیکن کھانے بے حد پسند آئے۔

لوگ بڑے زندہ دل اور لاطینی امریکہ کے باقی ممالک کی طرح رقص وموسیقی کے دل دادہ ہیں۔ کئی ساز میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ یہاں دیکھے اور کئی دھنیں ایسی تھیں جو پہلے کبھی سماعتوں سے نہ ٹکرائیں۔ ساٹھ سال کے پیٹے میں ایک خاتون موسیقی سے مبہوت ہوکر رقص کرنے لگتی ہے اور تھوڑی دیر میں اٹھارہ بیس سال کا ایک سمارٹ سا لڑکا سامعین کے ہجوم سے نکل کر خاتون کے ساتھ رقص میں شریک ہوجاتا ہے۔ میں آدھا گھنٹہ بازار کے ایک کونے میں جاری رقص وموسیقی کی اس محفل سے لطف اندوز ہونے کے بعد مجمع سے نکل گیا مگر محفل اسی جوش وجذبے سے جاری رہی۔ لاطینی

امریکہ میں ایسی محفلیں صدیوں سے جاری ہیں اور ہمیشہ جاری رہیں گی۔ کچھ وضاحت لاطینی امریکہ کی اصطلاح کی بھی برمحل ہوگی کیونکہ یہ اصطلاح بظاہر جغرافیائی لگتی ہے مگر اس کی بنیاد لسانی ہے۔ یوں تو میکسیکو براعظم شمالی امریکہ میں آتا ہے مگر لسانی اعتبار سے یہ لاطینی امریکہ کا حصہ ہے جیسے کیوبا وغیرہ۔ زمانہ قدیم میں یورپ کی غالب زبان لاطینی تھی اور سلطنت روم کی سرکاری زبان ہونے کے ناتے سے اپنے عہد کی دنیا کی سب سے معتبر زبان کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ لاطینی زبان سے چار نئی زبانوں کا جنم ہوا جو کہ ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد ہسپانوی، اطالوی، رومانین اور پرتگالی زبان کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہیں۔ امریکہ میں سپین کی نوآبادیات تو آزادی حاصل کرنے کے بعد دو درجن سے زائد خودمختار ممالک بن گئے مگر پرتگال کی ساری نوآبادی برازیل کی صورت میں ایک واحد ملک ہے۔ مختصر یہ کہ ہسپانوی اور پرتگالی زبان بولنے والے ممالک و باشندے جو امریکی براعظموں میں بستے ہیں، لاطینی کہلاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے علاوہ امریکی براعظموں کے دیگر بیشتر ممالک لاطینی امریکہ کا حصہ ہیں۔

میکسیکو کی ۳۲ ریاستیں ہیں مگر میکسیکو سٹی ان میں سے کسی کا حصہ نہیں، جیسے ہمارا اسلام آباد اور ہندوستان کا دلی وفاق کا علاقہ ہے۔ یہ شہر ریاست کا دارالخلافہ ہی نہیں بلکہ سیاسی، ثقافتی، تعلیمی اور اقتصادی مرکز بھی ہے۔ میکسیکو کی کل آبادی بارہ کروڑ ہے، جس میں سے بیس فیصد لوگ اسی شہر میں بستے ہیں۔ شہر کا طرز تعمیر ہسپانوی اور فرانسیسی طرز کا خوبصورت امتزاج ہے۔ سپین نے تو ۱۵۲۱-۱۸۲۱ تک پورے تین سو سال حکومت کی مگر یہ فرانسیسی طرز تعمیر کیسے در آیا؟ اس کا جواب یوں ملا کہ انیسویں صدی کے آخر میں ایک صدر ۳۵ سال تک حکمران رہا جس نے میکسیکو شہر کو پیرس بنانے کا اعلان کر رکھا تھا۔ ہمارے

ہاں تو عموماً یہ صرف سیاسی نعرہ ہوتا ہے مگر اس نے سینکڑوں عمارتیں پیرس جیسی کھڑی کر دیں۔ دومنزلہ سیاحتی بس کی چھت پر بیٹھے شہر کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے، میں نے اپنے برابر والی نشست پر براجمان امریکی بڑھیا سے پوچھا کہ تمہیں اس شہر کی کس چیز نے اپنی جانب زیادہ متوجہ کیا؟ بغیر کسی غور وفکر کے بڑھیا نے ترنت جواب دیا کہ "اس شہر کے رنگوں نے" شہر کے ہر گھر اور عمارت کو اس کے مکینوں نے اپنی اپنی پسند کے رنگوں کا لباس پہنا رکھا ہے۔ کسی عمارت کا رنگ گہرا نیلا ہے، ساتھ والے مکان کے مالک نے گلابی رنگ کو در و دیوار کا لباس بنایا ہے تو اس سے ملحقہ دکان والے نے سرخ اور اس کے ہمسائے نے گہرا سبز رنگ اپنے گھر کے باہر کرنا پسند کیا ہے، شاید ہی کوئی ایسا رنگ بچا ہو جو اس شہر کی کسی دیوار پر آپ کو نظر نہ آئے، اس کا مجموعی اثر یہ ہے کہ میکسیکو شہر قوسِ قزح کے رنگوں میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا رنگین مزاج شہر کم از کم میں نے دنیا میں کہیں اور نہیں دیکھا۔
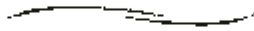
# امریکی سرحد کے اس پار

یہ ''تی خوانا'' ہے، امریکہ اور میکسیکو کا سرحدی شہر۔ تی خوانا کا ائیر پورٹ امریکی ریاست کیلی فورنیا کی سرحد سے بالکل ملحقہ واقع ہے۔ ائیر پورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے آپ کو کیلی فورنیا کا براون فیلڈ میونسپل ائیر پورٹ صاف نظر آتا ہے۔ ہالی وڈ کی فلموں کے ذریعے جو اس شہر کا تعارف اب تک ہوا تھا اس میں تو یہاں صرف ڈرگ لارڈ اور جرائم پیشہ افراد ہی ملتے ہیں اور مافیا کی اس شہر میں عملی طور پر حکومت ہے۔ انسانی سمگلر یہاں دندناتے پھرتے ہیں۔ آپ اسے میری خوش قسمتی کہہ لیں کہ مجھے یہاں ابھی تک کوئی بھی ایسا شخص نہیں ملا جس کے انڈر ورلڈ کے ساتھ روابط ہوں حالانکہ میں تو سارا دن پیدل ہی شہر کی خاک چھانتا رہا۔ یہاں جو لوگ ملے وہ تو بڑے بھلے مانس اور مجبتی سے لگتے ہیں۔

صبح کے وقت ناشتہ کر کے جب چہل قدمی کے لئے نکلا تو مرکزی سڑک پر واقع ایک اوورہیڈ برج پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ ائیر پورٹ سے ملحقہ علاقے کا

ذکر ہے۔عوام الناس کی کثیر تعداد دیکھ کر میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پل کے اوپر جا پہنچا۔تمام لوگوں کا رخ ایئر پورٹ کے رن وے کی طرف تھا۔وہ سب لوگ جہازوں کے اترنے اور چڑھنے کا غالباً منظر دیکھ رہے تھے۔ناظرین میں بہت بڑی تعداد بچوں اور خواتین کی تھی اور ہر عمر کے مرد بھی موجود تھے۔والدین بچوں کو جہازوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں مصروف تھے۔عوام کی اس مستقل بھیڑ سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت سے چھابڑی فروش بھی پل پر براجمان تھے۔انہی چھابڑی فروشوں میں سے ایک جو کہ مختلف جہازوں کے پلاسٹک سے بنے ہوئے ماڈل فروخت کر رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟ مجھے تو یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس آدمی نے مجھے جو وضاحت پیش کی وہ بھی کمال تھی، وہ کہنے لگا کہ اس ہجوم میں شامل لوگوں میں سے نوے فیصد وہ ہیں جو اپنی زندگی میں کبھی بھی جہاز پر سوار نہیں ہوئے ہیں، کچھ تو جبلی تجسس سے مغلوب ہو کر پہنچے ہیں، باقی بہت سے والدین ایسے ہیں جن کے بچے جہاز میں بیٹھنے کی یا پھر جہاز دیکھنے کی فرمائش کرتے ہیں، بچوں کا جی بہلانے کے لئے وہ انہیں اس جگہ لے آتے ہیں، انہی بچوں کو پلاسٹک کے ہوائی جہاز بیچ کر ہماری روزی روٹی بھی چل رہی ہے۔

دو ہمسایہ ملکوں کے درمیان اس سے زیادہ معاشی فرق کی مثال پوری دنیا میں کہیں نہیں ملتی جتنا فرق امریکہ اور میکسیکو کے درمیان ہے۔اس پل سے امریکی سرحد اور سرحدی کھمبے بھی صاف نظر آتے ہیں جن پر لگے زرد قمقموں کی قطار رات کے وقت دور سے دیکھنے پر روشنی کی ندی محسوس ہوتی ہے۔سرحد کے اس پار لاس اینجلس میں تین، چار مرتبہ میرا جانا ہو چکا ہے۔کیلی فورنیا کا قصبہ سان ڈیا گو تو بالکل ہی پاس ہے۔تی خوانا اور سان ڈیا گو کے درمیان بارڈر کراسنگ بھی موجود ہے جیسے لاہور اور واہگہ کے مقام پر جہاں پیدل

سرحد عبور کی جا سکتی ہے۔ ہر سال پانچ کروڑ لوگ امریکہ اور میکسیکو کے درمیان واقع کراسنگ عبور کرتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر اسے دنیا کی مصروف ترین بارڈر کراسنگ کہا جاتا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اتنی قربت کے باوجود امریکہ اور میکسیکو دو علیحدہ علیحدہ دنیائیں ہیں۔ رنگ، نسل، زبان کا فرق کوئی بڑی بات نہیں ہے، زندگی گزارنے کا ڈھنگ دونوں ملکوں میں اتنا مختلف ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ دونوں ملک ایک ہی سیارے پر واقع ہیں۔

آج تو یہ تصور سے بھی ماورا لگتا ہے کہ 1847 تک کیلی فورنیا کی پوری ریاست میکسیکو کا حصہ تھی اور امریکہ نے جب میکسیکو پر جنگ مسلط کرنے کے بعد کیلی فورنیا پر قبضہ کر لیا تو امن معاہدے میں جو شرمناک شرائط رکھی گئیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اب کیلی فورنیا سمیت میکسیکو کا بہت سارا علاقہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ہوگا۔ چونکہ سپین کی نوآبادیاتی حکومت سے آزادی حاصل کئے میکسیکو کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے عسکری اعتبار سے امریکی افواج کی مزاحمت کرنا ان لوگوں کے لئے ممکن بھی نہ تھا۔ یہاں یہ تذکرہ بھی مناسب ہوگا کہ برطانیہ کے برعکس سپین اپنی نوآبادیات سے عزت کے ساتھ رخصت نہیں ہو سکا۔ تقریباً ہر نوآبادی سے ہزیمت اٹھانے کے بعد ہی نکلا ہے۔ میکسیکو سے بھی دس سالہ خانہ جنگی کے بعد شکست فاش کا امکان دیکھا تو پھر دم دبا کر بھاگ گیا۔ یہ دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ سرحد کے اس طرف جہاں میکسیکو کا پانچواں بڑا شہر تی خوانا واقع ہے یہ ریاست بھی کیلی فورنیا زیریں کہلاتی ہے۔

خوان کارلوس میکسیکو میں فروٹ اور سبزیاں فراہم کرنے والی چھوٹی سی کمپنی چلاتا ہے۔ اس نوجوان نے مجھے بتایا کہ امریکہ اور میکسیکو کے درمیان باہمی تعلقات بھی ویسے ہی ہیں جیسے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہیں۔ خوان کارلوس تین سال تک

برطانیہ میں رہ چکا ہے۔ جہاں برصغیر سے آئے تارکین وطن کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، اس لئے وہ پاک وہند مخاصمت سے بخوبی واقف ہے۔میکسیکو کے لوگوں کی امریکہ سے نفرت اس لئے عجیب لگتی ہے کہ روزانہ اس شہر سے کیلی فورنیا جانے اور آنے والوں کی تعداد تین لاکھ ہے۔ ہر تیسرے، چوتھے گھر کا کوئی فرد امریکہ میں موجود ہے۔شائد اس کی بھی وہی وجوہات ہیں جو ہمارے اور ہندوستان کے موجودہ تعلقات کی ہیں۔

میکسیکو میں ایک اور عجیب وغریب بات دیکھی۔قدیم مقامی قبائل کے مقبروں کی جگہ کلیسا تعمیر کر دیئے گئے ہیں۔میں نے خوان کارلوس سے کہا کہ ویسے تو تم لوگ ہم مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہو کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے، مگر یہ سب کیا ہے؟ تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو نہ صرف شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظم بلکہ آسٹریلیا میں بھی عیسائیت کے غلبے کی واحد وجہ یورپی ممالک کا وہاں تسلط اور ان کا مسلط کردہ نوآبادیاتی نظام ہے۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں تو مقامی مذاہب شاید دو تین فیصد بھی وجود نہیں رکھتے اور اپنی بقاء کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں۔ایسے حقائق کے باوجود مسلمانوں کو الزام دینا کہ ان کا مذہب تلوار کے زور پر پھیلا ہے، زیادتی نہیں ہے؟میرے سوال کے جواب میں خوان کارلوس مسکرا کر کہنے لگا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہر طاقت ور کا نظریہ پھیلتا ہے۔محکوم کا نظریہ کہیں بھی نہیں پنپتا، براعظم چاہے دنیا کا کوئی بھی ہو۔

ہم باتوں میں مشغول تھے کہ یکا یک کالی بدلی آئی اور بارش شروع ہو گئی۔ امریکہ اور میکسیکو میں منقسم کیلی فورنیا کی ریاست میں ایک چیز سرحد کے دونوں جانب مشترک ہے، وہ ہے موسم اور بارش کے سبب زمین سے اٹھتی مٹی کی سوندھی خوشبو۔
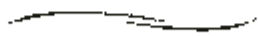
# لیون ٹراٹسکی کا گھر

آج دنیا کے امیر ترین پچاسی افراد کے پاس اس عالمِ رنگ وبو کی آدھی آبادی سے زیادہ سرمایہ جمع ہوگیا ہے۔سادہ ترین الفاظ میں ساڑھے تین ارب غریب لوگوں کے پاس جتنی مجموعی جمع پونجی ہے، یہ صرف پچاسی امیر ترین افراد ان سے زیادہ دولت کے مالک ہیں۔میرے سامنے اس وقت عالمی ادارے آکسفیم کی رپورٹ پڑی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ کے صرف پانچ خاندانوں کے پاس جمع دولت کا تخمینہ اس دنیا کی بیس فیصد غریب آبادی کے کل اثاثہ جات سے زیادہ ہے۔

لیون ٹراٹسکی کی قبر کے کتبے پر بنی درانتی اور ہتھوڑے کی کمیونسٹ علامت کو دیکھ کر میں سوچتا رہا کہ اگر سوویت یونین میں لینن کی موت کے بعد اسٹالن کی بجائے وہ صدر بن جاتا تو آج دنیا کا نقشہ کتنا مختلف ہوتا؟ سوویت یونین کے نام سے قائم ہونے والی پہلی اشتراکی ریاست ،جس کا سرخ پرچم ٹراٹسکی کی قبر پرلہرارہا ہے شاید آج بھی موجود ہوتی۔یوکرائن کے یہودی اکثریتی شہر اوڈیسہ میں پیدا ہونے والا یہ شخص جو میکسیکو شہر میں

اپنے صحن میں مدفون ہے، روس کی سرخ سپاہ کا معمار تھا۔ بالشویک انقلاب کے بانی لینن کا دستِ راست، وزیرِ دفاع و امورِ خارجہ، اس کی موت کے بعد منصبِ صدارت کا سب سے مضبوط امیدوار تھا۔ قرعہ فال مگر اسٹالن کے نام نکلا، جس کی وجہ غالباً ٹراٹسکی کا یہودی خاندانی پس منظر بھی ہو سکتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ کے سوویت انقلاب کی تفصیل پڑھنے کے لئے ٹراٹسکی آپ بیتی ''میری زندگی'' سے بہتر شاید ہی کوئی کتاب ہوگی۔ خاص طور پر انقلاب کی رات کا بیان تو ایک تاریخی شاہکار ہے۔ ہمارے ترقی پسند مرحوم دوست جاوید شاہین نے اس کتاب کا بڑا خوبصورت اردو ترجمہ کیا ہے۔

عہد ساز ادیب میکسم گورکی اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ میں نے ایک دفعہ لینن سے ذکر کیا کہ لوگ لیون ٹراٹسکی اور اس کے اختلافات کی افواہوں کا ذکر کرتے ہیں، لینن نے برملا ان افواہوں کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ''انسانی تاریخ میں لیون ٹراٹسکی جیسی ایک مثال دکھاؤ، جس نے ایک سال میں ایک ماڈل فوج تیار کی ہو'' اسٹالن نے اقتدار سنبھالنے کے بعد آمرانہ طرزِ حکومت اپنایا تو لیون ٹراٹسکی نے اس پر تنقید شروع کر دی۔ جوں جوں جوزف اسٹالن کے آمرانہ ہتھکنڈے بڑھتے گئے، ٹراٹسکی کی تنقید میں بھی شدت آتی گئی، اس کا کہنا تھا کہ سوشلزم کو اسٹالن ازم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ وہ زیادہ جمہوری مزاج کا آدمی تھا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بارے میں اس کی پیشین گوئیاں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی ہیں۔ بالآخر اسے جلا وطنی اختیار کرنا پڑی۔ ایک ٹراٹسکی کا ہی ذکر نہیں، لینن کی موت کے وقت پولٹ بیورو کے کل ستائیس ممبر تھے، اسٹالن کے تین سالہ اقتدار کے بعد ان میں سے دو باقی بچے تھے، بقیہ قتل کر دیئے گئے، جلا وطن ہو گئے، یا پھر سائبیریا کی جیلوں میں بھجوا دیئے گئے۔ یوں اشتراکی نظام عملی طور پر آمریت میں تبدیل کر دیا گیا۔

جلاوطنی کے ایام ٹراٹسکی نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ میکسیکو کے جس مکان میں گزارے اسے ''سرخ نشیمن'' کہتے ہیں۔قلعہ نما گھر کا رقبہ کوئی پانچ کنال ہوگا، جس کے کونوں پر مورچے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں اس نے بہت ساری مرغیاں پال رکھی تھیں۔ جن کو وہ خود دانہ ڈالتا تھا۔ انڈے اکٹھے کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک سچے مارکسسٹ کو لازمی طور پر جسمانی کام کرنے کا عادی ہونا چاہئے، گھر کے وسط میں باغیچہ ہے جو اس نے خود سینچا تھا، خود ہی گوڈی کرتا اور پودوں کی تراش خراش میں وقت گزارتا۔ اسی باغیچے میں ایک حوض کے ساتھ اس کی سادھی ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق اسے دفن نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کی وصیت کے مطابق جلا کر راکھ کو اس گھر کے آنگن میں دفنایا گیا ہے۔ اس باغیچے کے ایک طرف دو منزلہ لائبریری اور ڈرائنگ روم ہے جبکہ دوسری طرف رہائش کا حصہ ہے۔ اس انقلابی دانشور کے دن کا زیادہ حصہ اسی لائبریری میں پڑھنے لکھنے میں گزرتا۔ دیواروں پر اب جابجا ٹراٹسکی کی تصاویر آویزاں ہیں جو اس کی زندگی کے شب و روز کی آئینہ دار بھی ہیں۔ لائبریری سے باغیچے کی طرف جاتے ہوئے اس مشہور عالم تصویر پر نظر پڑتی ہے جس میں سوویت پولٹ بیورو کی سٹالن کی سربراہی میں ایک میٹنگ کی منظر کشی کی گئی ہے، ٹراٹسکی کی تصویر کی جگہ کرسی پر اس کی صرف ٹوپی دکھائی گئی ہے۔ کیونکہ اسٹالن کے دور میں ٹراٹسکی کی تصویر بنانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

بیڈروم کی تمام کھڑکیاں اور دروازے لوہے کی چار انچ موٹی چادر سے بنے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ بیت الخلاء کا دروازہ بھی آہنی اور چار انچ موٹا ہے۔ جیل کے دروازے بھی اتنے موٹے نہیں ہوتے جتنے یہاں تھے۔ سادہ سا سنگل بیڈ، عام چارپائی کے سائز سے بھی چھوٹا ہی لگتا ہے۔ ایک چھڑی اور ٹیبل پر چند کتابیں دھری ہوئی ہیں۔ اس کمرے کے ساتھ ہی بچوں کے سونے کا کمرہ ہے۔ دوسری طرف ڈائننگ روم اور اس سے ملحقہ کشادہ باورچی

خانہ۔کھانے کے کمرے میں میز پر کھانے کی پلیٹیں ویسے ہی چنی ہوئی ہیں جیسے ٹراٹسکی کی زندگی میں۔ یہ گھر آباد گھروں جیسا لگتا ہے، میوزیم بالکل بھی نہیں لگتا۔چند برس پہلے ٹراٹسکی کے گھر سے ایک سرنگ دریافت ہوئی ہے جو مشہور زمانہ مصورہ فریدا کاہلوں کے گھر جاتی ہے۔فریدا کا گھر چند سو میٹر کے فاصلے پر ہے۔جسے ''نیلا آستانہ'' کہا جاتا ہے۔وہ ٹراٹسکی کی محبوبہ بھی تھی اور ابتدائی دنوں میں میزبان بھی تھی۔کٹر کمیونسٹ ہونا دونوں کی قدر مشترک تھی۔

جلاوطنی کے ایام میں بھی ٹراٹسکی نے انقلابی خیالات کا پرچار جاری رکھا۔ انقلاب روس میں اس کے کردار اور عوامی مقبولیت کے باعث اسٹالن اسے اپنی حکومت کے لئے خطرہ سمجھتا تھا۔اسی لئے اس کے خون کا پیاسا تھا۔بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ٹراٹسکی جلاوطنی میں ہی قتل کر دیا گیا۔اس کے قتل کے بعد اس کے تمام بچوں کو بھی اسٹالن نے قتل کروادیا۔ٹراٹسکی کا ایک پوتا اب بھی میکسیکو شہر میں رہتا ہے۔جس کی اجازت سے اس کا گھر عوامی مقام میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔یہ گھر اب ٹراٹسکی کا مدفن بھی ہے۔

سوشلزم اور کمیونزم تو اب ماضی کے نعرے ہیں۔کارل مارکس کوئی پیغمبر نہیں تھا، ایک ذہین یہودی معیشت دان تھا، جس نے دو صدیاں پہلے یورپ کے معاشی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک متبادل معاشی نظام تجویز کیا تھا، جس سے انسانی دکھوں میں کمی آنے کا امکان تھا۔آج ہم مختلف دنیا میں سانس لے رہے ہیں، حالات آج کل کے بالکل مختلف ہیں۔مگر صرف پچاسی افراد کے پاس ساڑھے تین ارب انسانوں کی مجموعی مال و متاع سے زیادہ سرمایہ اکٹھا ہونا بھی غیر انسانی ہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جہاں بھی کثرت سے سرمایہ جمع کیا گیا وہاں کسی ایک، یا زیادہ افراد کی حق تلفی ضرور ہوئی ہے۔آج جہاں دنیا میں ایک طرف غربت بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف یہ بحث ہو رہی ہے کہ ڈالروں میں ارب پتیوں کے بعد اب پہلا کھرب پتی کون ہوگا؟ بل گیٹس، وارن بفیٹ یا

پھر کوئی اور ہوگا۔میرے ذہن میں مگر سوویت انقلاب کا قائد اور سرخیل لیون ٹراٹسکی ،اس کا گھر اور مدفن جانے کیوں گردش کرنے لگے ہیں،جس نے کہا تھا کہ دولت کی مساویانہ تقسیم ہونی چاہئے ۔باقی تمام راستے تباہی کی طرف جاتے ہیں۔
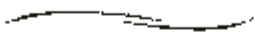
# فریدا کا نیلا آستانہ

گزشتہ ہفتے نیویارک کے ایک بوٹینیکل گارڈن میں اپنی طرز کی ایک منفرد نمائش کا افتتاح ہوا ہے۔ اس نمائش میں میکسیکو سے تعلق رکھنے والی مشہور عالم مصورہ اور شاعرہ فریدا کا ہلو کے گھر، باغیچے اور سٹوڈیو کی ماڈل اور اس فنکارہ کے چند تخلیقی شہ پارے پیش کیے گئے ہیں۔ ''فن، باغ اور زندگی'' کے عنوان سے ہونے والی اس نمائش میں بوٹینیکل گارڈن کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے جیسے مصورہ کی زندگی میں اس کا گھر، باغیچہ اور سٹوڈیو قائم تھا۔ ''دی کا ہلو شو'' کے نام سے یہ نمائش تو یکم نومبر تک جاری رہے گی، مگر میں ذرا زیادہ خوش قسمت نکلا کہ مجھے میکسیکو شہر میں واقع فریدا کے اس اصل گھر کو دیکھنے کا موقع میسر آ گیا جسے ''نیلا آستانہ'' کہتے ہیں۔ گھر کے باہر اور اندر گہرے نیلے رنگ کے در و دیوار کی نسبت سے نام پانے والی اسی رہائش گاہ میں فریدا پیدا ہوئی، اور 47 سال کی مختصر مگر بھرپور و بامعنی زندگی گزار کر یہیں فوت ہوئی۔ فنکار کی عظمت کو پیسے کے ترازو میں تولنا سراسر زیادتی ہے، لیکن

کیا کیا جائے کہ منڈی کی معیشت میں چیزوں کی اہمیت کا اندازہ فقط ان کی قیمت فروخت سے ہی لگایا جاتا ہے۔ چیز بے شک فنون لطیفہ پرمبنی اور اس کا خالق بھلے بائیں بازو کے نظریات پر ہی یقین کیوں نہ رکھتا ہو۔ گزشتہ برس فریدہ کاہلو کی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ 6.5 ملین ڈالر، یعنی 65 کروڑ روپے میں فروخت ہوئی ہے، جوکہ لاطینی امریکہ کے کسی بھی مصور کی اب تک فروخت ہونے والی سب سے مہنگی تخلیق ہے۔ میکسیکو کی مقامی کرنسی کو ''پیسو'' کہتے ہیں، جوکہ ایک ڈالر میں پندرہ آجاتے ہیں، پانچ سو پیسو کا کرنسی نوٹ دیکھیں تو اس کے ایک جانب فریدا کاہلو کی تصویر بنی ہوئی ہے اور دوسری طرف اس کے مصور شوہر ڈیگو راویرا کی تصویر پائی جاتی ہے۔ ان دو مثالوں سے فنکارہ کی اہمیت کسی حد تک اجاگر ہوجاتی ہے۔

کسی بھی ملک کے عوام عمومی طور پر کس طرح کے رویوں کا اظہار کرتے ہیں، یہ معلوم کرنے کا ایک آسان اور تیر بہدف طریقہ پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا ہے۔ میکسیکو شہر جوکہ ملک کا دارالحکومت ہے، اس کی میٹرو بس اور زیر زمین ریلوے مقبول ذرائع آمدورفت ہیں۔ ایئرپورٹ سے اترتے ہی میں میٹرو بس میں سوار ہوگیا جو لاہور، لندن یا دیگر ممالک کی میٹرو بس جیسی ہی ہے، البتہ اس کے بعد ریل کا سفر بہت دلچسپ رہا۔ حاصل سفر تو نابینا گلوکار کی لائیو پرفارمنس کو کہوں گا، میوزک کی مقبول دھنیں اس کے سینے پر باندھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر پر بج رہی تھیں اور ان دھنوں پر نابینا گلوکار گا رہا تھا۔ ایسی سریلی آواز زندگی میں کم کم ہی سننے کا اتفاق ہوا، ایسا خوبصورت الاپ کہ الفاظ میں بیان کرنے سے عاجز ہوں، اس طرز گائیکی کو مغرب میں ''کاراؤکے'' کہتے ہیں۔ پیٹ کے ساتھ ایک دھاتی ڈبہ اس نے باندھ رکھا تھا جس میں لوگ انعام کے طور پر سکے گرا رہے تھے۔

آوازیں لگا کر سودا بیچنے والوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو یہ احساس ہی مٹ

گیا کہ میں پاکستان سے بہت دور ہوں۔ آوازوں میں وہی روایتی طنطنہ، لجاجت اور خود اعتمادی مگر یہاں بکنے والے سودے ہم سے ذرا مختلف نوعیت کے ہیں۔ مثلاً لکھنے کے لیے رنگ برنگے مارکر، پھر ایک نوعمر لڑکی نے موبائل فون اور دیگر آلات پر میوزک سننے کے لیے پانچ پیسو کے ہیڈ فون کی آواز لگائی۔ تھوڑی دیر میں بیٹری ٹارچ بیچنے والا لڑکا نمودار ہو گیا۔ اسی اثنا میں ''کویا کان کا سٹاپ آ گیا، جس علاقے میں فریدا کاہلو کا گھر ہے۔ اسٹیشن سے دس منٹ کی مسافت میں نے پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ لندن کی گلی میں کونے کے نیلے مکان کے سامنے بورڈ آویزاں تھا فریدا کاہلو میوزیم۔ لاطینی امریکہ میں ایک قدر مشترک ہے کہ گلیوں، سڑکوں اور چوراہوں کے نام عمومی طور پر دیگر ممالک اور ان کے شہروں کے نام پر رکھے جاتے ہیں، آپ حیران ہوں گے کہ چلی کے دارالحکومت سنتیاگو میں ایک اہم چوراہا ''پاکستان چوک'' کا بھی ہے۔ حالانکہ ہماری حکومت نے تو اس ملک میں اپنا سفارت خانہ ہی بند کر دیا ہے۔

گہرے نیلے رنگ کے مکان میں داخل ہوا تو نیلی دیواروں، سرخ فرش اور سبز باغ نے ذہن میں وہی فضا بنا دی جو کہ فریدا کے ہاتھ سے بنی تصاویر کا خاصہ ہے۔ دنیا میں کسی بھی مصور نے گہرے رنگوں کا اپنی تخلیقات میں ایسی دلیری سے استعمال نہیں کیا جتنی بے تکلفی سے اس فنکارہ نے انہیں برتا ہے۔ دالان میں کپڑے اور کاغذ کی رنگ برنگی پتلیاں اور فریدا کے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا فانوس لٹک رہا ہے۔ ہم فریدا کے فن سے تو متاثر تھے ہی لیکن میکسیکو سٹی کے اس گھر کا باغیچہ بھی اس فنکارہ کے فن کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ فریدا 1907ء میں جب اس گھر میں پیدا ہوئی تو اس کے والدین نے اسے ملگدالینا کارمین کا نام دیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں وہ پولیو کا شکار ہو گئی جس سے اس کی ایک ٹانگ سکڑ گئی، اٹھارہ سال کی عمر میں ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہوئی جس میں اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ

دو سال کے لیے بستر سے لگ کر رہ گئی۔ اسی دوران اس نے فن مصوری کی طرف توجہ دی۔ اسی بیماری کے دوران اس کی ملاقات اپنے مصور شوہر ڈیگو راویرا سے ہوئی جو کہ محبت میں بدل گئی۔ ڈیگو راویرا نے اس کی بنائی ہوئی ابتدائی تصاویر دیکھ کر کہا کہ وہ قدرتی مصورہ ہے۔

فریدا کا ہلو کو عظیم مصورہ اور کٹر کمیونسٹ بنانے میں ڈیگو راویرا کا کلیدی کردار ہے۔ جسمانی معذوری اور علالت سے جس عظیم حوصلے کے ساتھ یہ خاتون لڑی ہے، انسانی تاریخ میں اس کی مثال کم کم ہی ملتی ہے، اس کا تمام فنی سفر شدید جسمانی تکلیف، وہیل چیئر اور تنہائی میں گزرا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی بنی ڈیڑھ سو کے قریب کل تصاویر میں سے پچپن اس کے اپنے پورٹریٹ ہیں۔ اس بابت فریدا دو وضاحتیں پیش کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ بہت زیادہ وقت تنہائی میں گزارتی ہے اور دوسری وجہ اس کی ذات ہی وہ عنوان ہے جسے وہ سب سے بہتر جانتی ہے۔

روس میں بالشویک انقلاب کے بانی رہنما، اور سویت یونین کی فوج کے پہلے سربراہ لیون ٹراٹسکی جب اسٹالن حکومت کی مخالفت کے سبب جلا وطن ہوئے تو وہ اسی نیلے آستانے میں دو سال رہائش پذیر رہے۔ وہ ٹراٹسکی جس کو لینن کے بعد سویت یونین کی صدارت کا سب سے مضبوط امیدوار قرار دیا گیا تھا، بالآخر پولٹ بیورو کی رکنیت اور سویت یونین کی مرکزی وزارت سے بھی محروم کر دیا گیا تھا، اسکی حفاظت کے لیے اس مکان کی بیرونی کھڑکیوں کو اینٹوں سے چن دیا گیا تھا، حفاظتی نقطۂ نظر سے دیواروں کی اونچائی میں بھی خصوصی طور پر اضافہ کیا گیا تھا۔ لیون ٹراٹسکی کا فریدا کے ساتھ معاشقہ بھی اہم بات ہے، کم و بیش دو سال اس گھر میں گزارنے کے بعد ٹراٹسکی کچھ ہی فاصلے پر اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہو گیا، اسی مکان میں اسے مبینہ طور پر اسٹالن کے کارندوں نے قتل کر دیا تھا۔ نیلے آستانے اور ٹراٹسکی کے مکان، جسے اب میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے ایک زیرِ زمین خفیہ سرنگ تھی،

جسے پچھلے دنوں ہی عوام کے لیے کھولا گیا ہے۔ کوچہ میانہ میں واقع لیون ٹراٹسکی کا ''سرخ نشیمن'' جہاں اس کی سادھی بھی ہے، ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔ فریدا کے بیڈروم میں ایک منظر دیکھ کر میں حیران ہوا، وہاں کارل، مارکس، لینن، فریڈرک اینگلز اور ماؤزے تنگ کے علاوہ جوزف اسٹالن کی بھی تصویر موجود تھی، ظاہر ہے فریدا کے اپنے ہاتھ سے تخلیق کردہ، حیرت ہے کہ ۱۹۵۴ء میں اپنی وفات سے پہلے جو نامکمل تصویر وہ تخلیق کر رہی تھی وہ بھی اسٹالن کی ہی تھی، تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ زندگی کے آخری ایام میں لیون ٹراٹسکی کیسا تھ فریدا اور اسکے شوہر کی بول چال بند ہوگئی تھی۔ ڈیگوراویرا اور فریدہ کے درمیان ۱۹۳۹ء میں طلاق ہوگئی تھی، مگر اگلے برس دونوں کی دوبارہ شادی ہوگئی، طلاق کی وجہ ڈیگوراویرا اور فریدا کے غیر ازدواجی تعلقات بیان کیے جاتے ہیں۔ فریدا کا اپنا بیان ہے کہ ''میں پیدائشی مصورہ اور کتیا ہوں'' فریدا کی موت کے بعد اس کے شوہر نے ''نیلا آستانہ'' اس شرط پر حکومت کو عطیہ کر دیا کہ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ اسی لیے گھر میں سیر کرتے ہوئے یہی محسوس ہوتا ہے کہ فریدا ابھی کہیں آس پاس ہی ہوگی۔ اس عظیم فنکارہ کی زندگی پر ہالی ووڈ نے ایک فلم بھی تخلیق کی ہے، ''فریدا'' نامی اس فلم کو آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ آٹھ سوگز کے دو منزلہ گھر سے نکلا تو ایک یورپی جوڑا آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہا تھا، خاوند نے اپنی ادھیڑ عمر بیوی کو طعنہ دیا کہ تم پر فریدا کے نیلے آستانے کا سایہ پڑ گیا ہے، اسی لیے بدتمیزی پر اتر آئی ہو۔
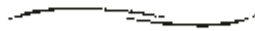
حصہ سوم

# دیس پردیس

# نوبیل انعام یافتگان کا ترک وطن

وہ شخص جو نیکر پہنے ہوئے اپنی گاڑی دھو رہا ہے، دو سال پہلے تو یاما یونیورسٹی کے اس پروفیسر کو بیالوجی کے شعبے میں عالمی نوبیل انعام سے نوازا گیا ہے۔ میں نے اس دن سے پہلے کبھی کسی نوبیل انعام یافتہ شخصیت کو روبرو نہیں دیکھا تھا، اسی لیے اپنے دوست کی بات سن کر ٹھٹک گیا۔ اس آدمی کو اپنی 660 سی سی سوزوکی کار کو، ایک ہاتھ میں بہتے پانی کا ربڑ والا پائپ اور دوسرے ہاتھ میں شیمپو میں ڈوبا ہوا اسفنج پکڑے، دھوتے ہوئے میں کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ محلے کے دوسرے عمومی گھروں کی طرح بیالوجی کے اس پروفیسر کا گھر بھی پانچ مرلہ رقبے پر مشتمل ہوگا، جس کے گیراج کے سامنے وہ اپنی سواری کو اگلے ہفتے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اتوار کے دن باقی اہالیانِ شہر گھر کے کاموں اور صفائی ستھرائی میں جت جاتے ہیں، پروفیسر بھی اپنے کام نمٹا رہا تھا۔ کھچڑی بالوں والے ادھیڑ

عمر کے اس سائنسدان اور اس کی زندگی میں مجھے تو کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے اپنے محلے میں زیادہ مقبول بھی نہیں لگا، کیونکہ اہل محلّہ آتے جاتے ہوئے اس سے سلام، دعا بھی کوئی زیادہ نہیں لے رہے تھے۔ ندی کنارے واقع مذکورہ سائنسدان کے اس محلے میرا اتوار کے دن اکثر گزر ہوتا ہے۔ اس ندی کے شفاف پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں صاف دکھائی دیتی ہیں، دونوں کناروں پر درختوں کی قطاریں ہیں جن پر کبوتر، کوے چڑیاں اپنی اپنی بولی بولتے ہیں۔ میری عادت ہے کہ چھٹی کے دن ان مچھلیوں اور پرندوں کو ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈالتا ہوں، خوراک کے حصول کے لیے جب یہ سب لپکتے ہیں تو بہت بھلے لگتے ہیں۔ کبوتر خاص طور پر جلدی فرینک ہو جاتے ہیں اور ہاتھوں سے ڈبل روٹی چھیننے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اب اس ندی کنارے محلے میں جب بھی جاتا ہوں تو متذکرہ پروفیسر سائنسدان کے گھر کی طرف اچٹتی ہوئی اک نگاہ غیر ارادی طور پر ڈال لیتا ہوں۔ میرا اب تک کا مشاہدہ یہی ہے کہ وہ عام شہریوں کی طرح ایک عامی زندگی گزار رہا ہے۔ گو کہ اس نے بیالوجی کے شعبے میں غیر معمولی کام سر انجام دیا ہے، مگر اس بات کا احساس تو اس کی یونیورسٹی اور لیبارٹری سے متعلق احباب کو ہی ہوگا، اپنی گلی، محلے میں تو وہ ایک معمول کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے تین افراد کو اب تک عالمی نوبیل انعام دیا گیا ہے۔ پہلا نوبیل انعام میرے آبائی ضلع کی تحصیل کبیر والہ کے ایک گاؤں رائے پور میں پیدا ہونے والے ہر گوبند کھرانہ اور دوسرا ڈاکٹر عبدالسلام نے بالترتیب بیالوجی اور فزکس کے شعبے میں اپنی خدمات کی بدولت یہ انعام پایا، جبکہ تیسرا نوبیل انعام سوات کی طالبہ ملالہ یوسفزئی کو امن کے شعبے میں دیا گیا ہے، یہ ایک المیہ ہے کہ مختلف دہائیوں میں انعام پانے والے، ان تینوں افراد کو جب نوبیل پرائز سے نوازا گیا تو یہ پاکستان چھوڑ کر بیرون ملک جا چکے تھے۔ دونوں سائنسدان تو یہ دنیا بھی چھوڑ چکے ہیں جبکہ

ملالہ یوسف زئی نے گزشتہ دنوں برطانوی شہریت حاصل کر لی ہے، چند سال قبل طالبان کی طرف سے کیے گئے قاتلانہ حملہ میں معجزانہ طور پر بچ جانے کے بعد وہ برطانیہ میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہے۔ سوچتا ہوں کہ عالمی شہرت کے حامل یہ نوبیل انعام یافتگان پاکستانی اگر ملک چھوڑ کر نہ جاتے تو پاکستان کو ان باصلاحیت افراد سے بہت فائدہ پہنچتا۔ میں کسی مذہبی و سیاسی بحث کو ہوا دینا نہیں چاہتا۔ بس ایک سادہ سی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، کہ جب چوتھے اور پانچویں پاکستانی کو نوبیل انعام سے نوازا جائے تو اسے ترک وطن نہ کرنا پڑے۔ ہمارے معاشرے میں اتنی برداشت پیدا ہو جائے کہ رنگ، نسل، مذہب مسلک، اور لسانی اختلاف کے باوجود لوگ پر امن طریقے سے اکٹھے رہنا سیکھ لیں۔ پاک سرزمین کی مٹی سے جس شخص کا بھی خمیر اٹھا ہے، میرے نزدیک ریاست پاکستان پر اس کا میرے برابر حق ہے، اور یہ حق اس سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ چاہے اس شخص کا خاندانی پس منظر اور نظریات کچھ بھی ہوں۔

جاپان کے دور افتادہ ساحلی شہر کی ندی کنارے واقع محلے میں جب کبھی میں نوبیل انعام یافتہ مذکورہ سائنسدان پروفیسر کو دیکھتا ہوں، تو دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش پاکستان کے گلی کوچوں میں بھی ایسے اعلیٰ دماغ پرسکون اور نارمل زندگی گزار سکیں۔ اپنی عظمت کے خراج کے طور پر انہیں اپنی دھرتی نہ چھوڑنی پڑے۔

ایسے تو کوئی ترک سکونت نہیں کرتا
ہجرت وہی کرتا ہے جو بیعت نہیں کرتا

دوسری جنگ عظیم میں جس چیز نے امریکہ کو اپنے اتحادیوں اور حریفوں پر فیصلہ کن

برتری دلائی وہ ایٹم بم تھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ جس آئین سٹائین نے ایٹم بم ایجاد کیا وہ خود جرمن یہودی تھا، جرمنی میں ہی پلا بڑھا، اور تادم مرگ اپنا تمام تحقیقی کام جرمن زبان میں ہی کرتا تھا، ہٹلر کی تنگ نظری نے دیگر یہودیوں کی طرح اسے بھی ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا خواب ہے کہ آئندہ جس پاکستانی کو نوبل پرائز ملے وہ ترک سکونت کی بجائے کسی تعلیمی ادارے میں نوجوان طلباء کو اپنا علم منتقل کرے۔ دانش وحکمت کو پھیلائے۔ اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہے اور پاکستان میں روشنیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہو جائے۔
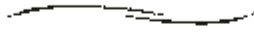
# بٹوے کا درد

پہلی دفعہ سنیں تو ''بٹوے کا درد'' معاشی موضوع محسوس ہوتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے روپے، پیسے کی جیب میں آمدورفت سے متعلق کوئی مسئلہ ہوگا۔طب اور صحت کے شعبے سے دوردور کا واسطہ نہیں لگتا۔دلچسپ حقیقت مگر یہ ہے کہ جدید طرزِ زندگی کے انسانی صحت پر جو منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں، بٹوے کا درد انہی مسائل میں سے ایک ہے،مقبول عالمی سائنسی جریدے ''نیچر'' کے مطابق طویل عرصے تک پینٹ کی پچھلی جیب میں بٹوہ رکھنے سے کولہے کی ہڈی کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی بھی ٹیڑھی پوزیشن میں رہتی ہے،جس کے نتیجے میں کولہے کے درد کے علاوہ کمر کا مستقل درد بھی نکل سکتا ہے۔طبی شعبے کے ماہرین نے اس مرض کو بٹوے کے درد کا نام دیا ہے۔بنیادی طور پر تو یہ اعصاب اور پٹھوں کی بیماری ہے ،جس کا سائنسی نام ''پری فورمس سینڈروم'' ہے،لیکن چونکہ یہ مرض پینٹ کی پچھلی جیب

میں بٹوہ رکھ کر بیٹھنے سے پیدا ہوسکتا ہے، اسی لئے اسے ''موٹے بٹوے کی بیماری'' کہتے ہیں۔ بٹوے کے اندر روپے کتنے ہیں؟ اس چیز کا مذکورہ درد سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ سوال معاشیات کے موضوع سے متعلق ہے۔

بٹوے کا درد ایک شریان کے دبنے یا الجھنے سے پیدا ہوتا اور شدت اختیار کرتا ہے، جسے ڈاکٹر حضرات ''سیاٹک نرو'' کہتے ہیں۔ اس مرض کی تشخیص کے لئے ماہرین طب M.R.I اور FAIR ٹیسٹ تجویز کرتے ہیں۔ مرض کی علامات میں کولہے اور ٹانگوں میں درد رہنا اور کبھی کبھار ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف بھی شامل ہے۔ گرچہ یہ مرض جان لیوا نہیں ہے، مریض کی مالش سے بھی افاقہ ہوجاتا ہے، مگر اسے معمولی مت جانیے، ایک بار اس درد میں مبتلا ہوجائیں تو پھر آپ کو سرجری بھی کروانا پڑسکتی ہے۔ بعض اوقات فزیوتھراپی سے بھی کام نہیں بنتا ہے۔ جراحی ہی واحد حل رہ جاتا ہے۔

پٹھوں اور اعصاب کے درمیان باہمی عدم توازن سے پیدا ہونے والی اس بیماری اور تکلیف کی اصل وجہ دباؤ اور کھچاؤ بیان کئے جاتے ہیں۔ میڈیکل سائنس پاکستان میں عمومی طور پر خشک مضمون تصور کیا جاتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس مضمون کے بارے میں ہماری قومی رائے سے اس کی اہمیت میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا ذاتی معاملہ ہے، تو اس کے متعلق بعض سیانوں سے سنا ہے ایف ایس سی کا ڈنک کھائے ہوئے لوگوں میں میڈیکل کے شعبے سے متعلق کچھ نہ کچھ دلچسپی ساری زندگی باقی رہتی ہے۔ میری والدہ کو اللہ جنت نصیب کرے، یہ شدید خواہش رکھتی تھیں کہ میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانوں کی خدمت کروں، ان کا مفت علاج کروں، میرا عزم بھی ایف ایس سی پری میڈیکل میں داخلہ لیتے وقت یہی تھا، مگر نتیجہ میری توقعات کے مطابق اور گھر والوں کی توقعات کے برعکس ایسا آیا، کہ میں کسی سرکاری میڈیکل کالج میں داخلے کی میرٹ

لسٹ میں شامل نہیں تھا۔ والد صاحب نے دوبارہ امتحان دیکر میرٹ پر آنے کے لئے جوش دلانے کی ناکام کوششیں کی مگر میں نے ''سرنڈر'' کا طعنہ سننا گوارا کرلیا، پلٹ کر نہیں دیکھا، گریجوایشن کی طرف بڑھ گیا۔ ان دنوں پاکستان میں ابھی چائنا کے ڈاکٹروں کا رواج نہیں آیا تھا۔

بٹوے کا درد جو آج کل دنیا بھر کے طبی ماہرین کی گفتگو کا مقبول موضوع بنا ہوا ہے، دراصل ایک موذی مرض ہے۔ یہ مریض کو ہمیشہ کے لئے اپاہج بھی بنا سکتا ہے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ اس مرض سے بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس ضمن میں ماہرینِ صحت کا سب سے بنیادی مشورہ تو یہ ہے کہ اپنا بٹوہ پینٹ کی پچھلی جیب کی بجائے قمیض یا جیکٹ، کوٹ وغیرہ کی جیب میں رکھنے کی عادت ڈال لیں۔ اگر کولہے کی جیب میں بٹوہ رکھنا ناگزیر ہو تو بیٹھنے سے پہلے اسے نکال لیں۔ ماہرین کا مشورہ اس بابت سر آنکھوں پر، مگر اس انداز نشست و برخاست میں بٹوے کی گمشدگی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں روزنامہ جنگ سے وابستہ ایک سینیئر اور مقبول صحافی دوست کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا، تو میں نے حسبِ عادت جیب سے بٹوہ نکال کر بیٹھتے وقت صوفے کے اوپر رکھ دیا، صحافی و دانشور دوست نے کہا کہ میری بھی یہی عادت ہے کہ بیٹھتے وقت بٹوہ نکال کر جیب سے کہیں باہر رکھ دیتا ہوں، اور اسی عادت کے سبب کئی مرتبہ بٹوہ گم کر چکا ہوں۔ اس پر میں نے بٹوے کے درد کا تذکرہ کیا تو انہوں نے اس موضوع پر مضمون لکھنے کی تجویز دی، جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ بیٹھتے وقت بٹوے کو پچھلی جیب سے نکال کر سب کے سامنے رکھنے میں ایک جھجھک یہ بھی ہر وضع دار آدمی کو دامن گیر ہوتی ہے کہ کہیں اردگرد بیٹھے لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ نوٹ دکھا رہا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کی پچھلی جیب بٹوہ رکھنے کے لئے استعمال نہ کی جائے۔ اس بابت طبی ماہرین کے مشورے کے علاوہ نوک

وزڈم بھی یہی ہے کہ پچھلی جیب تو ہوتی ہی پرائی ہے،اس جیب کے کٹ جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔نوآموز جیب تراش بھی اسے با آسانی اپنا ہدف بنا کر کاٹ سکتے ہیں۔
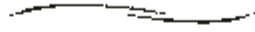
# فرآز صاحب

عہد ساز شاعر احمد فرآز کو ہم سے بچھڑے آج کئی برس ہو گئے ہیں۔ پاکستانی معاشرے کی ایک خوبصورت روایت ہے کہ برسی کے دن مرنے والے کی شخصیت اور اس کی زندگی کے واقعات کا محبت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ احمد فرآز سے دوستی کا دعویٰ تو مجھے ہرگز نہیں مگر ان سے نیازمندی ضرور رہی، ان کی میزبانی کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ ان کی شاعری تو شعروادب سے شغف رکھنے والے حضرات پڑھتے ہی رہتے ہیں، آج ان کی شخصیت کے بارے میں گپ شپ کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں ان سے متعلق کئی واقعات گردش کر رہے ہیں، رسم دنیا، موقع اور فقط دستور زمانہ نبھانے کے لیے نہیں بلکہ اسلیے قلم بند کر رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ باتیں دلچسپی کا سبب ہوں گی۔ فرازصاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تو یہ تھا کہ وہ اپنی شاعری میں جس محبت اور وفا کا پرچار کرتے تھے، وہ خود بھی اس کا عملی نمونہ تھے۔ میرے نزدیک یہ بات یوں اہم ہے کہ محبت اور وفا کی باتیں تو سبھی شاعر کرتے ہیں مگر ذاتی زندگی میں بعض اوقات ان کے ہاں یہ اجناس ناپید ہوتی

ہیں۔فراز صاحب سراپا محبت شخص تھے۔

سید احمد شاہ علی کے نام سے 1931ء میں پیدا ہونے والے اس خوش نوا شاعر نے 77 سال کی عمر پائی ،لیکن تامرگ جوان رہا۔ میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ کوہاٹ میں پیدا ہونے والا لمبا،تڑنگا،سرخ وسفید یہ پٹھان کیسے ایسی مرصع اردو بولتا ہے کہ اہل زبان عش عش کر اُٹھتے ہیں۔صرف اردو کا تو ذکر ہی کیا،میرے گھر تشریف لائے تو نیا انکشاف ہوا،رات کو فراز صاحب دیر سے سوئے تھے،میاں چنوں میں ہم نے عالمی مشاعرے کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں پاکستان کے تمام بڑے شعراء تشریف لائے تھے،رات کو تین بجے مشاعرہ ختم ہوا اور مہمان شعراء میرے گھر آئے ،وہاں بھی دیر تک محفل چلتی رہی۔صبح ہوئی تو مجھے عطاء الحق قاسمی صاحب نے احمد فراز کو جگانے کے لئے کہا جو میرے بھائی کے کمرے میں محو خواب تھے۔فراز صاحب کی بذلہ سنجی تو ادبی حلقوں میں مشہور ہے مگر وہ جلالی بھی بہت تھے،ان کی طبیعت کے جلال کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے قاسمی صاحب سے گزارش کی کہ آپ ذرا میرے ساتھ آئیں اور خود ہی انہیں نیند سے جگائیں۔احمد فراز سے قاسمی صاحب کی بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی ،قاسمی صاحب نے بیڈ روم کا دروازہ بڑے دھماکہ خیز انداز میں کھولا اور باآواز بلند علامہ اقبال کا یہ مصرع پڑھا۔

''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو''

فراز صاحب نے نیم خوابی کے عالم میں کروٹ بدلی اور کمبل اوڑھتے ہوئے ٹھیٹ پنجابی میں کہا''تے فیر غریباں نوں جگاؤ جا کے،سانوں کیوں چھیڑ دے او۔۔۔!!'' (تو پھر غریبوں کو جگاؤنا،کیوں ہمیں تنگ کر رہے ہو) ان کی گوجرانوالہ،سیالکوٹ لہجے کی رواں،دواں پنجابی نے مجھے ایک حیرت میں ڈال دیا۔

فراز صاحب مشاعرہ باز شاعر نہیں تھے مگر جب کبھی کوئی دوست بلا لیتا تو انکار بھی

نہیں کرتے تھے۔ ہمارے ہاں تشریف لائے تو مجھ سے کہنے لگے کہ میں مشاعرے پڑھنے کے لئے کبھی نہیں گیا، بس دوستوں سے ملاقات کے لیے چلا جاتا ہوں۔ لاہور سے عطاء الحق قاسمی کے ساتھ ایک ہی گاڑی میں آئے تھے، قاسمی صاحب نے گھر پہنچتے ہی اپنے بیگ سے کچھ کپڑے نکال کر مجھے دیے اور کہا کہ وہ مشاعرہ میں انہیں پہننا چاہتے ہیں اس لیے ذرا استری کروالاؤ، پھر میں لباس تبدیل کرتا ہوں۔ فراز صاحب نے سیاہ رنگ کے شیونگ بکس میں سے بنت انگور کی بوتل نکالی اور مجھ سے کہا کہ باورچی خانہ سے ایک گلاس اور تھوڑی سی برف لاؤ، اس کے بعد قاسمی صاحب سے مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ ''آپ اپنا بیرون بدلیں، ہم اپنا اندرون بدلتے ہیں''

امریکہ میں میرے دوست عامل راجپوت سے روایت ہے کہ اس کی خصوصی دعوت پر فراز صاحب سینٹ لوئیس تشریف لائے ، ایئرپورٹ سے گھر کی جانب جاتے ہوئے فراز صاحب نے کہا کہ پیاس لگی ہے!! میرے دوست نے کہا کہ کسی بھی فونٹین سے پیاس بجھالیں، امریکہ میں پانی پینے کے لیے جگہ جگہ فوارے لگے ہیں۔ پچاس سال پہلے تک کالے اور سفید فام لوگوں کے لیے الگ الگ فوارے تھے، فراز صاحب نے میرے دوست کی بات سن کر کہا کہ ''یہ تو سنا تھا کہ امریکہ میں شراب بہت عام ہے، لیکن یہ نہیں پتا تھا کہ یہاں فوارے لگے ہوئے ہیں''۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر شاعری تو کی جاسکتی ہے مگر نثر میں بات چیت کا رواج نہیں ہے، ہمارے ہاں بادہ نوش عموماً بہک جاتے ہیں اور عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، عوامی زبان میں بات کریں تو پی کر ''بندر'' بن جاتے ہیں۔ احمد فراز لیکن قرینے والے آدمی تھے، محفل کے آغاز میں اگر انہوں نے آپ کو ''صاحب'' کہہ کر مخاطب کرلیا تو پھر صہبا کی مقدار جو بھی رہی ، آخر دم تک ''صاحب'' کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتے تھے۔

پاکستان میں جمہوریت کے قیام اور اس کے فروغ کے لیے انہوں نے بڑی جدوجہد کی ، شدید صعوبتیں اٹھائیں، ضیاء الحق کی آمریت کا کچھ عرصہ انہوں نے جیل میں

گزارا اور زیادہ تر عرصہ جلا وطنی میں گزارا۔ جلا وطنی کے چھ سال میں سے وہ زیادہ تر برطانیہ اور کنیڈا میں مقیم رہے۔ میرے بڑے بھائی رانا بابر حسین جو کہ آجکل پارلیمانی سیکرٹری برائے خزانہ پنجاب ہیں طویل عرصہ انگلستان میں مقیم رہے، وہ بتاتے ہیں کہ جلا وطنی کا وقت برطانیہ میں فراز صاحب نے بڑی کسمپرسی کے عالم میں گزارا تھا۔ یہ غالباً ان کی زندگی کا سب سے سخت وقت بھی تھا، ذاتی طور پر احمد فراز نے ورنہ آسودہ زندگی بسر کی تھی، مگر وہ ایک سچے ترقی پسند شاعر تھے، صرف نعرے بازی کی حد تک نہیں تھے، اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی ہم نے انہیں جنرل پرویز مشرف کی آمرانہ حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے، اسلام آباد کی سڑکوں پر دیکھا۔ فراز صاحب کے تینوں بچوں کے نام بھی بڑی حد تک ان کے نظریات کے آئینہ دار ہیں جو کہ سعدی، شبلی اور سرمد ہیں۔ فراز صاحب کی شخصیت بڑی بارعب تھی، پاٹ دار آواز میں بڑا طنطنہ تھا مگر غرور و تکبر ان کو چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ ورنہ جتنی شہرت اور عزت ومحبت انہیں نصیب ہوئی ایسی شہرت وعزت کسی کم ظرف کو مل جائے تو متکبر ہو جاتا ہے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ فراز صاحب کی شاعری زیادہ خوبصورت ہے یا پھر ان کی شخصیت۔ اپنے دوستوں اور اردگرد کے لوگوں کا وہ خاص خیال رکھتے تھے، نئے لکھنے والوں کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے، ذاتی کام کے لیے کسی سے درخواست کرنا ان کی غیرت کے منافی تھا، مگر انجان لوگوں کی سفارش کر دیا کرتے، جن سے کوئی صلے کی بھی امید نہ ہوتی تھی۔

معاصرانہ چشمک اور حسد کے سبب بعض ادیب احمد فراز کے متعلق کچھ منفی باتیں بھی منسوب کرتے رہتے ہیں، مگر ان سے محبت کرنے والوں نے کبھی انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا، ایسے ہی ایک نقاد دوست جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، اور میں نہیں چاہتا کہ ان کی شہرت پانے کی آرزو پوری ہو اس لیے نام تحریر نہیں کروں گا، مجھے بتانے لگے کہ میں احمد فراز کو بہت پرانا جانتا ہوں، اس آدمی نے زندگی کے رس کی ایک ایک بوند کو نچوڑ کر لطف کشید کر کے پیا ہے۔ زندگی کے لطف و کرم سے مستفید ہونے والا شخص میرے نزدیک خوش قسمت

ہے اور یہ کوئی زیادہ بڑا جرم نہیں ہے۔ احمد فراز وہ شخص ہے جس نے کسی لابی کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالصتاً اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اردو ادب میں اعلیٰ وارفع مقام پایا۔ یوں تو ہلال امتیاز، ستارہ امتیاز، نگار ایوارڈ سمیت بے شمار قومی اور عالمی اعزازات اس عظیم شاعر کے حصے میں آئے مگر اس کا اصل تمغہ اس دھرتی کے لوگوں کی اس سے والہانہ محبت ہے، جو کم کم ہی کسی اور شاعر کے حصے میں آئی ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

# ہماری این فرینک

پچھلے کئی دنوں سے این فرینک ایک بار پھر یہاں خبروں کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ بنیاد اس بار یہ بنی کہ ٹوکیو کی چالیس لائبریریوں میں موجود این فرینک کی ڈائری ، جوکہ کتابی شکل میں جاپانی سمیت دنیا کی پچپن زبانوں میں شائع ہوچکی ہے، اس کے تمام نسخوں کے بہت سارے صفحات کو پھاڑ دیا گیا ہے جس کے بعد یہ کتب پڑھنے کے قابل نہیں رہی ہیں۔

ایک نوعمر یہودی لڑکی جس نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران نازی فوج سے جان بچانے کے لئے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ چھپتے ہوئے ،روپوشی کے ماہ وسال کے دوران یہ یادداشتیں تحریر کیں، این فرینک ہٹلر کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوئی اور پھر بیگار کیمپ میں سولہ سال کی عمر میں زندگی کی بازی ہار گئی، مگر اس کی ڈائری نے اسے جنگ کے دوران یہودیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی علامت بنادیا۔

این فرینک کی کتابیں تلف کرنے کے سب سے زیادہ واقعات ٹوکیو کے اس محلے میں پیش آئے جہاں ہمارا دفتر ہے۔یہاں پندرہ میں سے تیرہ سرکاری لائبریریوں میں موجود این فرینک کی کتابوں کو نقصان پہنچا ہے۔اس سے آپ ٹوکیو اور پھر جاپان میں لائبریریوں کی مجموعی تعداد کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔اس واقعے پر ردِّعمل کا اندازہ آپ یوں لگالیں کہ اسرائیل کی ایمبیسی نے ایک طرف تین سو کتابیں تحفے میں پیش کردی ہیں، دوسری طرف صرف ایک دن میں فقط ایک لائبریری میں بیس لوگوں نے ٹیلی فون کر کے نہ صرف نقد رقم اور کتابیں عطیہ کرنے کا وعدہ کیا ہے بلکہ ٹوکیو پبلک لائبریری کو این فرینک کے متعلق سو کتابیں موصول بھی ہو چکی ہیں۔لتھونیا میں جاپانی قونصلیٹ سگیہارا جس نے جنگ عظیم کے دوران سینکڑوں یہودیوں کو ویزے جاری کر کے ان کی جان بچائی تھی، اس کے نام سے 137 کتابیں الگ موصول ہوئی ہیں۔

این فرینک کی شخصیت اور ڈائری سے میرا پہلا تعارف اتفاقاً پیرو کے دارالخلافہ لیما میں ہوا تھا۔میری فلائیٹ سویرے سویرے لیما پہنچ گئی تھی لیکن مجھے وہاں سے ایک چھوٹے شہر نکلنا جانا تھا، جس کے لئے شام تک کوئی پرواز دستیاب نہیں تھی۔سوچا شہر کا رخ کرتے ہیں، گھومتے گھماتے ہسپانوی عہد کی تعمیر کردہ مرکزی لائبریری میں پہنچا تو وہاں ایک نمائش جاری تھی۔ یہ این فرینک کی ڈائری اور اس کے حالات زندگی کو اجاگر کرنے کے لئے گشتی نمائش تھی جو اب پیرو کے دارالحکومت پہنچی تھی۔تیرہ، چودہ سال کی معصوم سی بچی جو صرف زندہ رہنے کی خواہش رکھتی ہے۔کیسے بھوکی، پیاسی اپنے گھر میں چھپ کر ماہ و سال گزارتی ہے۔سوات کی ملالہ یوسفزئی کے لئے اہل یورپ کی ہمدردی اور محبت کی وجہ میری نظر میں تو این فرینک ہے۔دونوں کے حالاتِ زندگی بہت زیادہ ملتے ہیں۔دونوں کی وجہ شہرت ان کی ڈائری کے علاوہ یہ بھی ہے کہ دونوں ہم عمر ہیں۔فرینک اور ملالہ اپنے ہی دیس

میں اجنبی ٹھہرتی ہیں کیونکہ شہر پر ظالموں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

ایمسٹرڈیم جانا ہوا تو میں خصوصی طور پر این فرینک کے گھر کو دیکھنے کے لئے بھی گیا، جو کہ اب میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ چار منزلہ عمارت میں ہر چیز ویسی کی ویسی ہی ہے جیسے این فرینک چھوڑ کر گئی تھی۔ اس میوزیم اور وہاں تصاویر کو دیکھنے کے بعد انسانیت سے محبت رکھنے والے ہر اہلِ دل کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ تو سمجھی تھی کہ اس کا باپ نازی فوج کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے مگر وہ معجزانہ طور پر بچ نکلا، یہ مکان اس نے 1940 میں خریدا تھا اور بیوی بچوں کی موت کے بعد اس نے اس مکان کو میوزیم میں تبدیل کر دیا۔ این فرینک کی ڈائری بھی اس کے والد نے اس کی موت کے کئی سال بعد شائع کروائی۔ ہالینڈ کے دارالحکومت میں پیتل سے بنائے گئے این فرینک کے مجسمے کے پاس کھڑا میں سوچتا رہا کہ اس معصوم لڑکی کو مارنے کی کیا وضاحت ہو سکتی ہے؟ اب سوچتا ہوں ہٹلر کے فوجی بھی اس سے ملتی جلتی کوئی توجیح پیش کر دیتے جیسے ملالہ کو نشانہ بنانے والے طالبان دلائل پیش کرتے ہیں۔

نیلسن منڈیلا کہتے تھے کہ جیل میں اسیری کے دوران این فرینک کی ڈائری نے انہیں ہر بار نیا حوصلہ بخشا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسرائیل کی ریاست اور یہودیت ایک چیز نہیں ہیں۔ اسرائیل فلسطین کی زمین پر غاصبانہ قبضے کے نتیجے میں گزشتہ صدی کے دوران معرضِ وجود میں آیا جبکہ یہودیت پانچ ہزار سال پرانا مذہب ہے۔ ویسے بھی یہودیوں کا سب سے بڑا مسکن اسرائیل نہیں بلکہ امریکہ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اہل یورپ نے یہودیوں پر بڑے مظالم ڈھائے ہیں اور اپنے اجتماعی ضمیر کا بوجھ اتارنے کے لئے اسرائیلی ریاست تشکیل دی تھی۔ یہودیوں کے لئے الگ وطن کا تصور قابلِ فہم ہے اور ان پر ہونے والے مظالم سے بھی کوئی صاحب مطالعہ انکار نہیں کر سکتا، مگر اس ظلم کی

سزا غریب فلسطینیوں کو نہیں ملنی چاہیے۔ فلسطینی اپنے گھروں میں ویسے ہی بے وطن ہو گئے جیسے این فرینک ہوئی تھی۔

این فرینک کی کتابوں کو ٹوکیو کی چالیس لائبریریوں میں کس نے تباہ کیا؟ اس کی تحقیقات جاری ہیں۔ یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر اور جاپان اتحادی تھے اور پاکستان کی طرح یہاں بھی ہٹلر کو پسند کرنے والوں کی کمی نہیں ہے، مگر اکثریت ایسی نہیں ہے، جاپان میں این فرینک کی کتاب دنیا میں امریکہ کے بعد سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہے، مزید یہ کہ ایمسٹرڈیم میں اس کے گھر ہر سال تیس ہزار جاپانی سیاح حاضری دینے جاتے ہیں۔ این فرینک کی کتابوں کی تباہی سے مجھے بار بار ملالہ یوسفزئی کی کتاب کی مجوزہ تقریب رونمائی کی پشاور میں منسوخی یاد آ رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹوکیو میں این فرینک کی کتابوں کو تلف کرنے والے چور تھے اور پشاور میں ملالہ کی کتاب کی رونمائی روکنے والوں کی اس صوبے میں حکومت ہے۔
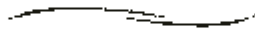
# دُنیا میری نظر میں

جرمنی سے تعلق رکھنے والے عالمی شہرت یافتہ سفرنامہ نگار جینو، جن کا امریکہ کے متعلق تحریر کردہ سفرنامہ انٹرنیشنل بیسٹ سیلرز میں شمار ہوتا ہے۔ اور لیتھونیا سے تعلق رکھنے والی میری دوست مصنفہ ڈاکٹر دالیا سٹاپانکوٹی کا چند برس قبل ''ارژنگ'' کے لئے انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔ میرا ان سے سوال تھا کہ کیا سفرنامہ فکشن ہے؟ دونوں مصنفین کا جواب اثبات میں تھا۔ مزید ڈاکٹر دالیا کا کہنا تھا کہ اگر سفرنامے سے کہانی کا عنصر نکال دیا جائے تو وہ محض گائیڈ بک بن کر رہ جائے گا۔ فقط حقیقت نگاری کسی سفر کی روداد کو اچھا بنانے کے لئے ناکافی ہے۔ نیز سفرنامے کی خوبصورتی یہی ہے کہ اس میں ادب کی تمام اصناف سما سکتی ہیں۔ اردو سفرنامے کا مسئلہ یہ ہے کہ عمومی طور پر یہ مسافرنامہ ہوتا ہے۔ سفرنامہ نگار کا ہیرو ہونا بھی ہمیں گوارا ہے مگر کردہ وناکردہ گناہوں کا بیان اور سینے میں دبی ہوئی سفلی خواہشات کو واقعات بنا کر پیش کرنا قارئین پر گراں گزرتا ہے۔

میرے اکثر سفرنامہ نگار دوست کتاب کی فروخت بڑھانے کے لئے اپنے اوپر

بے جا بہتان طرازی کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ایسے ماحول میں ناصر ناکاگاوا کا سفرنامہ ''دنیامیری نظر میں'' تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ یہ سفر کے تجربات کو اچھوتے اور بالکل منفرد انداز میں پیش کرتا ہے۔ بلاشبہ ثبات مسافر کو نہیں، سفر کو حاصل ہے، محسوس ہوتا ہے کہ ناصر ناکاگاوا نے اس حقیقت کو پالیا ہے۔ اسی سبب سے اس کتاب میں آپ کو ناظر کم اور منظر زیادہ تر دکھائی دے گا۔ ''دنیامیری نظر میں'' مصنف کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ اس سفر نامے میں آپ کو وہ تمام خوبیاں نظر آئیں گی۔ جو ان کے پہلے سفرنامے ''دیس بنا پردیس'' میں پائی جاتی ہیں۔ پہلی ملاقات میں ناصر ناکاگاوا کے بارے میں میرا یہ تاثر قائم ہوا کہ وہ ایک انتہائی مہذب، حساس، نرم خو اور انسان دوست شخص ہیں، جب ان کی تحریروں کے مطالعے کا موقع ملا تو ان کی شخصیت کی مذکورہ خوبیاں ان کی تحاریر میں بھی جابجا نظر آئیں۔ جاپان میں رہتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ اپنے ہم وطن پاکستانیوں کی علمی اعتبار سے مدد کی ہے۔ ان کی قائم کردہ ویب سائیٹ اردونیٹ نہ صرف جاپان میں مقیم پاکستانیوں کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کر رہی ہے۔ بلکہ اردو زبان کی ترویج کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔ میرے مربی باباجی اشفاق احمد اکثر دعا دیا کرتے تھے کہ ''اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطاء فرمائے'' اس اعتبار سے میں ناصر ناکاگاوا کے سفرنامے کو ایک صدقہ جاریہ سمجھتا ہوں، کہ اس کے مطالعے سے بہت سارے پاکستانی قارئین وطن کو فائدہ پہنچے گا۔ اردو ادب میں جہاں خودنمائی کے نقطۂ نظر سے لکھے گئے سفرناموں کی بھرمار ہے، وہاں ''دنیامیری نظر میں'' ایک منارہ نور اور روشن مثال ہے، کہ سفرنامے کو انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔ ڈیڑھ صدی پیشتر سر سید احمد خاں کے لندن سے متعلق تحریر کئے گئے سفرنامے سے ہوتے ہوئے حکیم محمد سعید کی جاپان کے سفر سے متعلق لکھی گئی روداد اور عہد موجود تک بہت ساری اچھی مثالیں

بھی اس بابت موجود ہیں، جن مصنفین نے نیکی کے جذبے کے تحت اپنے سفر کے تجربات و تاثرات کو قلم بند کیا۔ مطمع نظر یہ تھا کہ بعد میں آنے والے مسافروں کا بھلا ہو سکے۔ یہ سفر نامہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

''دنیا میری نظر میں'' میں شامل اکثر تحریریں اردونیٹ جاپان کے پلیٹ فارم سے قارئین تک پہنچتی رہی ہیں۔ ان تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کروانا قابلِ تحسین عمل ہے۔ شاہ صاحب کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے جاپان میں ربع صدی گزاری اور اس سماج کا گہرائی میں مشاہدہ، مطالعہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں جاپانی زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ یہاں مقیم پاکستانی کمیونٹی میں شاید ہی دو، چار فیصد لوگ اتنی اچھی جاپانی زبان جانتے ہوں گے، جتنی مہارت مصنف کو حاصل ہے۔ زبان کسی بھی ثقافت کا DNA ہوتی ہے۔ جتنی بہتر آپ زبان جانتے ہوں گے، اتنے ہی اچھے انداز میں آپ اس قوم اور اس کی معاشرت کو سمجھ سکیں گے۔ ناصر ناکاگاوا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوصف، اکثر تارکین وطن سے متعلق جاپانی قوانین آسان اردو زبان میں سمجھانے کی تحریری سعی کرتے رہتے ہیں۔'' دنیا میری نظر میں'' کے مطالعے کے بعد یہی عرض کروں گا کہ بیان چاہے جاپان کا ہے یا پھر کسی اور دیس کے متعلق، ناصر ناکاگاوا کی نظر سے دیکھنے پر دنیا اور زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے، انتہائی اعلیٰ طباعت، آفسٹ پیپر، اور قیمت بھی اس مہنگائی کے دور میں مناسب ہے۔ پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے اچھے کتب خانوں پر باآسانی دستیاب ہے۔ جو احباب خصوصاً جاپان کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میرا انہیں مشورہ ہے کہ یہ کتاب ضرور پڑھیں۔

# اسلم کولسری - ایک تابندہ شاعر کی رُخصتی

دس شعری مجموعوں کے خالق شاعر کہنہ مشق صحافی خوبصورت مترجم اور بے مثال ادیب اسلم کولسری اب ہم میں نہیں رہے۔ انتہائی دکھ کے ساتھ علمی و ادبی حلقوں میں ان کی طویل علالت کے بعد وفات کی خبر سنی گئی۔ جیسی تابندہ ان کی شاعری تھی ان کی شخصیت بھی ویسی ہی خوبصورت تھی۔ ہم اہلِ قلم اپنی تحریروں اور شاعری میں جس محبت کا والہانہ اظہار اور پرچار کرتے ہیں، بدقسمتی سے ایسا کم ہوتا ہے کہ اسی تناسب سے وہ محبت، خلوص اور دیگر اخلاقی خوبیاں ہم اہلِ قلم کی ذاتی شخصیت کا بھی حصہ ہوں۔ کبھی کبھی مگر ایسے خوبصورت ادیب اور شاعر بھی ادبی منظرنامے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ جن کی تحریر بھی لاجواب اور شخصیت بھی باکمال ہوتی ہے۔ جن انسانی خوبیوں کا اظہار اور تقاضا وہ اپنے محبوب اور سماج سے کرتے ہیں۔ خود بھی ان اخلاقی خوبیوں کا پیکر ہوتے ہیں۔ اپنی ادبی زندگی میں ملنے والے قلم قبیلے پر نظر دوڑاتا ہوں تو اسلم کولسری ان مستثنیات میں ایک درخشاں مثال نظر آتے ہیں، جو سراپاءِ محبت تھے۔ سرتاپا محبت میں ڈوبے ہوئے، محبتیں بانٹتے ہوئے۔

یوں تو ان کی پیدائش 1946ء میں اوکاڑہ کے ایک نواحی گاؤں کولسر میں ہوئی تھی، مگر ایسے عظیم لوگوں کا سن پیدائش زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہوا کرتا ہے، اہم واقعہ اور بنیادی اہمیت ان جیسے درویش صفت فنکاروں کا ہم دنیاداروں میں سے ہوکر گزرنا ہے۔ اسلم کولسری ستر سال اپنی درویشی پر قائم رہتے ہوئے ہم اہل دنیا کو محبت کا سلیقہ اور جینے کا ممکنہ خوبصورت طریقہ اپنی زندگی کی مثال سے سکھاتے گزر گئے۔ ہماری دنیا کی آلائشوں نے انہیں چھوا تک نہیں۔ سخت محنت، جد وجہد اور مشکلوں میں زندگی گزاری مگر ان کی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ ان کو کوئی غم بھی ہوسکتا ہے۔ ان کی اجلی مسکراہٹ اصلی تھی۔ بالکل بناوٹی اور رسمی نہیں تھی۔ وفات سے چند روز قبل لاہور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر تیمارداری کے لئے حاضری دی تو وہ چھڑی لے کر، بیٹے عمران اسلم کا کاندھا پکڑ کر، بڑی مشکل سے بستر سے اٹھ کر بیٹھک تک پہنچے، ان کی اجلی مسکراہٹ اور اسکی زندگی وتازگی پر جسمانی نقاہت کا ذرا بھی اثر نہیں تھا۔ وزن انتہائی کم ہوچکا تھا، شیو بڑھی ہوئی تھی، لیکن واللہ چہرے سے نور برستا تھا، جوان کی عمر بھر کی نیکیوں کا ثمر تھا۔

اسلم کولسری کا ذکر ان کے گاؤں کولسر کے تذکرے کے بغیر ادھورا ہے۔ کولسر نہ صرف ان کے نام کا حصہ تھا۔ بلکہ ان کی شخصیت کا بھی لازمی جزو تھا۔ اوکاڑہ چھاؤنی کی تعمیر وتوسیع کی غرض سے یہ گاؤں خالی کروالیا گیا تھا۔ اس ہجرت نے اسلم کولسری کی شخصیت پر بہت گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑے۔ کہتے تھے جولوگ ہندوستان سے ہجرت کرکے آئے تھے ان کا گاؤں تو وہاں موجود تھا مگر وہ بھارت کے اندر، وہاں جا نہیں سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا کہ ہم جا تو سکتے ہیں، مگر گاؤں وہاں نہیں رہا۔ بتاتے تھے کہ ایک بار اجڑے ہوئے گاؤں میں پہنچا تو گھروں کے مسمار شدہ آثار میں سے ہوتا ہوا اپنے پرانے گھر تک پہنچ گیا، وہاں ایک نیم شکستہ کچی دیوار پر میری ماں نے مٹی کی

لپائی کی ہوئی تھی، میری مرحومہ والدہ کا لپائی کرتے ہوئے ہاتھ کا نشان وہاں باقی رہ گیا تھا۔ میں اس ہاتھ کے نشان سے دیر تک لپٹ کر روتا رہا۔ اپنے گاؤں کولسر کے قصے سناتے ہوئے کہا کرتے کہ اس کا نام تو ''محبت پورہ'' ہونا چاہیے تھا۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ میری بہن برقعہ پہنے ہوئے اوکاڑہ کے بازار سے گزر رہی تھی کہ کسی بزرگ نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ اجنبی آواز سن کر ٹھہر گئی۔ بزرگ میرے والد کا نام لے کر اس سے کہنے لگا کہ تم کیا اس کی بیٹی ہو؟ میری بہن نے اثبات میں سر ہلایا جو کہ اس طرح پردے میں تھی کہ صرف آنکھیں دیکھی جا سکتی تھیں، بزرگ کو اس نے پہچان لیا تھا، بچپن میں اپنے گاؤں میں بہن نے اسے دیکھ رکھا تھا، مگر حیران رہ گئی کہ اس نے پہچانا کیسے؟ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے تمہارے والد کی خوشبو ادھر سے آئی تھی، اس لئے تم سے پوچھ لیا۔

اسلم کولسری کا گاؤں جب اجڑ گیا تو پھر ان کی ذات میں بسنے لگا تھا، ان کے نام کا حصہ بن کر تو تاریخ میں بھی زندہ رہے گا۔ ایک بے حس سے نظر آنے والے آدمی کا بتاتے ہیں کہ وہ چھوٹے قد کا نیم پر ہنہ رہنے والا ایسا آدمی تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس پر کسی غم یا خوشی کا اثر نہیں ہوسکتا۔ سارے جسم پر اسکے بال تھے۔ ساری زندگی کسی نے اسکو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا، مگر جب گاؤں اجڑ گیا، تو ایک شام کسی اجڑے مکان سے رونے کی آواز سنائی دی، لوگوں نے جا کر اس مکان میں دیکھا تو وہ بے حس نظر آنے والا رحما نامی شخص اپنے گھر میں لگے نیم کے پیڑ سے لپٹ کر زاروقطار رو رہا تھا۔

اسلم کولسری نے ابتدائی زندگی میں مزدوری کی اور ساتھ ساتھ پڑھائی کرتے رہے، یہاں تک کہ ایم اے کر لیا اور لاہور پہنچ کر صحافت سے منسلک ہو گئے۔ بابا جی اشفاق احمد انہیں اردو سائنس بورڈ لے گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد روزنامہ دنیا جوائن کر لیا۔ ان جیسے بلند پایا اور خوبصورت شاعر ہند، سندھ میں کم کم ہی پیدا ہوئے ہیں، مگر منکسر المزاج ایسے کہ

خود کو فقط شاعر کہتے ہوئے بھی شرما جاتے۔

ان کی شاعری سے میرا پہلا تعارف کالج فرسٹ ایئر میں اس شعر کے ذریعے ہوا، جو ملک کے دیگر طلباء ہوسٹلز کی طرح ہمارے ہوسٹل میں بھی بے حد مقبول تھا،

شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

طلبا ہوسٹل میں قیام پذیر لڑکوں کے لئے اس شعر کے ساتھ ذاتی نسبت اور اپنائیت پائی جاتی ہے۔ان کی شاعری کے بارے میں دوستوں کا خیال ہے کہ وہ زندگی کے ویرانے پر لڈنے والی گھنگھور گھٹا اور اس آہستہ خرام بادل کی مانند ہے، جو اپنی دھیمی دھیمی کن من سے دھرتی کو ایک طویل عرصے کے لئے اس کی اندرونی پرتوں تک سیراب کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔یہی سیرابی زندگی کے ویرانے کو چمن میں بدلنے کی معجزانہ اہلیت بھی رکھتی ہے۔ان کی رحلت سے اداس دل یہ اشعار پڑھ کر اور بھی دکھی ہو جاتا ہے۔

سوچ سوالی کر جاتے ہیں
صبحیں کالی کر جاتے ہیں
اسلم چھوڑ کے جانے والے
آنکھیں خالی کر جاتے ہیں

اسلم کولسری سے مل کر پتہ چلتا تھا کہ انسان اتنا نفیس بھی ہوسکتا ہے۔وہ نہ صرف آدمیت کے معیار پر پورا اترتے تھے بلکہ ان جیسے لوگوں کو دیکھ کر ہی آدمیت اور انسانیت کا معیار قائم کیا جاتا ہے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔ایسے بامروت تھے کہ ہمارے ساتھ آخری ملاقات میں، ہمارے استفسار، پر اپنی بیماری کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہنے لگے، کہ

ڈاکٹر صاحب شکوہ کررہے تھے، کہتے تھے حیرت ہے کہ روزنامہ دنیا والے اپنے کارکن صحافیوں کا بالکل بھی خیال نہیں رکھتے۔ اپنے ادارے کی جانب سے بیماری کے مشکل وقت میں اختیار کی گئی سرد مہری، اور بے حسی کی شکایت بھی انہوں نے اپنی طرف سے نہیں کی بلکہ جنرل ہسپتال کے ایک ڈاکٹر کی رائے بیان کی، جو کہ ان کا علاج کر رہا تھا۔
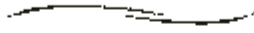
# فن اور فنکار

روس سے تعلق رکھنے والا میرا دوست سرگئی شولا خوف با جا بجا تا ہے۔جاز بینڈ کی روح یہ ساز پاکستانی عوام کے لئے اجنبی نہیں کیونکہ ہمارے ہاں شادی،بیاہ کے موقع پر روایتی طور پر یہی جاز بینڈ بجایا جاتا ہے۔انگریز کے نوآبادیاتی عہد کی یہ یادگار اب ہماری ثقافت کا حصہ ہے۔سیکسوفون لکھتے ہوئے جھجک رہا ہوں کہ اس میں ایک واہیات سا اشارہ ملتا ہے۔سرگئی سیکسوفون بجانے کا ماہر ہے اور یہی اس کا پیشہ بھی ہے ۔ایک مہنگے شراب خانے میں وہ ہر شب ہر آدھ گھنٹہ یا پھر ایک گھنٹہ کے بعد محفل کو گرمانے کے لئے پیانو کی سنگت پر 10 منٹ جاز کا یہ ساز بجاتا ہے۔طبعاً بڑا اثر میلا ہے۔حالانکہ اس کے گردوپیش کا ماحول خاصا کھلا ڈھلا لبرل ہے۔سرگئی سے جب پہلی ملاقات ہوئی تو ایک مشترکہ دوست نے میرا تعارف کرواتے ہوئے اسے بتایا کہ میں مصنف اور شاعر ہوں۔بعد ازاں گاہے بگاہے ملاقات رہنے لگی۔ایک دن اس نے مجھ سے ایک فنکارانہ سوال کیا یا یوں کہیے کہ اپنا مسئلہ بیان کیا۔کہنے لگا کہ یار ایک بات بتاؤ جب لوگ تمہیں شاعر کے طور پر پکارتے

ہیں یا پھر تم اپنا تعارف بطور شاعر کرواتے ہو تو تمہیں کوئی جھجک یا شرم تو نہیں آتی؟ مجھے تو اپنا تعارف بطور موسیقار کرواتے ہوئے بے حد شرم محسوس ہوتی ہے۔

میں نے اپنے احساسات سے اسے آگاہ کیا کہ مجھے تو لگتا ہے کہ شعروادب میری شناخت کا حصہ ہیں۔اس لئے مجھے تو کوئی شرم وغیرہ نہیں آتی۔سرگئی نے بتایا کہ وہ تو ٹھیک ہے مگر بطور موسیقار میں لوگوں کو تعارف کرواتا ہوں تو لگتا ہے کہ یہ غیر سنجیدہ سی بات ہے۔ پورے سائبیریا میں سرگئی شولاخوف کے پائے کے چند ہی سیکسوفون بجانے والے ہوں گے۔اس کے باوجود وہ کیوں شرماتا ہے؟ میں نے اس پر بہت سوچا۔یہ مسئلہ صرف سرگئی کا نہیں ہے پوری دنیا میں بے شار فنکار اپنا تعارف اپنے فن کے حوالے سے کرواتے ہوئے شرماتے ہیں۔میں بہت سارے ادیبوں کو جانتا ہوں جو کہ بہت اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔مگر انہوں نے اپنا کلام کبھی بھی شائع نہیں کروایا۔میری نظر میں اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ایک تو یہ کہ فنکار خود کو چھوٹا سمجھتا ہو اور فن کو بڑا یا پھر دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی ذات اور شخصیت کو بڑا سمجھتا ہو مگر فن کو چھوٹا اور نا قابلِ تکریم سمجھتا ہو،جیسے غالبؔ نے کہا کہ

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

بہت سال پہلے سردیوں کے موسم میں اپنے آبائی شہر میں مجھے اپنے گھر منعقد ہونے والی ایک شامِ غزل یاد آ گئی۔اللہ بخشے مشہور گلوکار پرویز مہدی لاہور سے آئے تھے۔محفل جوبن پر تھی۔اس عالم میں کلاسیکی موسیقی کے ایک مقامی سریلے گویے منظور جھلا سے ہم لوگوں نے پرویز مہدی کی اجازت سے غزل سننے کی فرمائش کی،پرویز مہدی نے مائیک ان کے آگے کر دیا۔مگر منظور جھلا نے گانے سے انکار کرتے ہوئے یہ شرط رکھی کہ وہیں بیٹھوں گا جہاں آپ بیٹھے ہیں،پرویز مہدی بھی بڑی مرنجاں مرنج

شخصیت تھے۔فوراً جھجکے بغیر اٹھے اور جگہ خالی کردی، بلکہ اپنا باجا بھی استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔غزل سننے کے بعد سو روپیہ بھی منظور جھلا کو بطور انعام بھی عطا کیا۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میرے شہر کا یہ فنکار اپنے فن پر شرمندہ نہیں تھا۔اور نہ ہی فن موسیقی کو چھوٹا سمجھتا تھا۔میری نظر میں پختہ اور بڑا فنکار کبھی بھی اپنے ہنر کو ناپختہ اور کم درجہ نہیں سمجھتا، البتہ اس میں کئی ارتقائی منازل آتی ہیں۔بعض صورتوں میں فنکار تو بڑے اچھے ہوتے ہیں مگر وہ ذاتی طور پر ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں اور خود شناسی کے عہد سے گزر رہے ہوتے ہیں
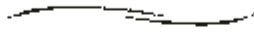
# دنیا کے دس بڑے بنک اور بینکاری کی ابتدا

معتبر امریکی ادارے فوربز نے 2017 کے بہترین امریکی بینکوں کی فہرست شائع کی ہے اور جے پی مورگن چیز کو پہلے نمبر کا بنک قرار دیا ہے۔ دنیا کے مگر دس بڑے بنکوں کی فہرست میں 2017 کا سال کئی اہم تبدیلیاں لے کر آیا ہے۔ سب سے اہم تبدیلی تو یہ ہے کہ عالمی سطح پر اب پہلے چار بڑے بنک چین سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابھی کچھ ہی سال پہلے دنیا کے ٹاپ ٹین کی اس فہرست میں چین کا ایک بھی بنک شامل نہیں تھا۔ عالمی مالیاتی ادارے (S&P) ایس اینڈ پی گلوبل مارکیٹ انٹیلی جنس نے دنیا کے دس بڑے بنکوں کی یہ فہرست جاری کی ہے، اس عالمی سطح پر اولین دس بڑے بنکوں کی درجہ بندی پر امریکہ میں خاص طور پر بہت بحث ہو رہی ہے، کیونکہ دس میں سے صرف اسکے دو ہی بنک اس لسٹ میں شامل کئے گئے ہیں۔ ایک جے پی مورگن چیز اور دوسرا بنک آف امریکہ۔ زیادہ پرانی بات نہیں کہ اس درجہ بندی میں امریکی بینک مستقل طور پر نہ صرف اول پوزیشن پر ہوتے تھے بلکہ دس میں سے آدھے تو ضرور امریکہ سے تعلق رکھنے والے مالیاتی ادارے تھے۔

فوربز اور سی این بی سی کے فراہم کردہ اعدادوشمار کے مطابق عالمی سطح پر دس اولین

بنکوں کے اثاثہ جات اوسطاً دو سے تین کھرب ڈالر کے درمیان بیان کئے گئے ہیں۔فقط عالمی سطح پر اول درجے پر آنے والے بنک یعنی انڈسٹریل اینڈ کمرشل بنک آف چائنہ کے مجموعی اثاثہ جات کی کل مالیت کا تخمینہ تین کھرب سے زیادہ یعنی ساڑھے تین کھرب ڈالر بیان کیا گیا ہے۔اس فہرست میں جاپان کے بھی دو بنک شامل ہیں۔جو بالترتیب مٹسوبشی بنک اور جاپان کا ڈاک خانہ ہیں۔اس کے علاوہ برطانیہ کا بھی ایک بنک HSBC اس لسٹ میں شامل ہے۔جو دس معتبر ترین مالیاتی ادارے قرار دیئے گئے ہیں۔

اس بابت برطانوی جریدے اکانومسٹ کی شائع کردہ فہرست تھوڑی سی مختلف ہے،اس فہرست میں عالمی رینکنگ میں بنکوں میں تیسرے نمبر پر امریکی ادارے جے پی مورگن چیز کو قرار دیا گیا ہے۔اور جاپانی بنکوں کو آخری نمبروں پر رکھا گیا ہے۔مگر یہ بنیادی حقیقت صاف دکھائی دے رہی ہے کہ بینکنگ کے شعبے میں اب چین عالمی سطح پر لیڈر بن چکا ہے اور یہ حقیقت اب تسلیم شدہ ہے کہ اس عالم رنگ وبو میں ٹاپ کے پانچ بنکوں میں سے اثاثہ جات اور حجم کے اعتبار سے چار بنک چین کے ہیں۔ہاں! البتہ ترتیب میں تھوڑا بہت فرق ہوسکتا ہے،چند معتبر ادارے تیسرے نمبر پر جاپانی بنک مٹسوبشی کو قرار دے رہے ہیں۔پاکستان میں مٹسوبشی کمپنی اپنی گاڑیوں اور الیکٹرونکس کی وجہ سے جانی جاتی ہے۔یوں تو معاشیات بالعموم اور بینکاری کا شعبہ بالخصوص خشک خیال کئے جاتے مضامین ہیں مگر بینکاری کی ابتدا کی کہانی بہت دلچسپ ہے اور آپ کو یہ یقیناً بہت پسند آئے گی۔جدید بینکاری کا آغاز اٹلی میں ہوا تھا۔تاریخی اعتبار سے سلطنت روم کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔روم شہر میں بھی معیشت اور بازار کا اصول جنس کے بدلے جنس تھا۔مال کے بدلے مال کے اصول پر چلنے والے معاشرے اور اس کے بعد بھی دنیا بھر یہودی قوم معیشت اور بازار کے معاملات میں باقی اقوام عالم سے ہمیشہ آگے رہی ہے۔زمانہ قبل از اسلام ہو یا قبل

از مسیح کے دور کا احوال اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو معیشت پر یہودی اثرات واضح اور نا قابل تردید نظر آئیں گے۔قصہ کوتاہ یہ کہ سلطنت روما کے دارالحکومت روم شہر کی معیشت پر بھی یہودیوں نے پنجے گاڑھ رکھے تھے، یہودی تاجر شہر کے داخلی دروازوں پر ہی بیٹھے ہوتے تھے۔بنچوں پر بیٹھے ان یہودیوں کی سرگرمیاں بہت عجب نوعیت کی تھیں۔جیسے ہی خریدار لوگ شہر میں داخل ہوتے، وہ لکڑی کے بنچوں پر بیٹھے ہوئے ان یہودیوں کے پاس اپنا مال امانتاً رکھوادیتے چونکہ بازار کا رواج مال کے تبادلے کا تھا، جس یہودی کے پاس بھی تاجر اپنا سامان رکھوا کر جاتا وہ یہودی اپنے نام سے ایک رسید جاری کر دیتا۔کہ حامل رقعہ ہذا کا فلاں فلاں سامان میرے پاس امانتاً پڑا ہے اور مطالبہ پر فوری مہیا کر دیا جائیگا۔اب تاجر یہ رسید لے کر شہر کے بازاروں میں آزادانہ گھومتا پھرتا اور اپنا مطلوبہ سامان تلاش کرتا۔جس جگہ سودا بن جاتا وہ تاجر اس دوکاندار کو یہودی کی جاری کردہ مذکورہ رسید تھما دیتا۔کہ میرا فلاں فلاں سامان فلاں یہودی کے پاس امانتاً پڑا ہے، وہاں سے جا کر وصول کرلو۔دوکاندار تاجر سے رسید لیکر اسے مطلوبہ سودا فراہم کر دیتا اور یہودی سے جا کر رسید دیکر سامان وصول پاتا تھا۔بازار اب بھی بارٹر سسٹم یا جنس کے بدلے جنس کے اصول پر چل رہا تھا۔تبدیلی یوں آئی کہ یہودیوں کا بازار میں اعتبار بتدریج بڑھتا چلا گیا، اور یہ تاثر مضبوط ہوتا چلا گیا کہ وہ لین دین میں بے ایمانی نہیں کرتے، امانت دار لوگ ہیں۔اگلے مرحلے میں شہر کے دوکاندار روم شہر میں خریداری کی غرض سے آنے والے لوگوں سے یہودی تاجر کی جاری کردہ رسیدیں جو وہ شہر کے داخلی دروازے پر بیٹھے گاہکوں کا سامان وصول کر کے انہیں جاری کرتے تھے، وصول کر کے ان کا مطلوبہ مال فراہم کر دیتے تھے مگر ان رسیدوں کے بدلے یہودیوں سے سامان وصول کرنے کی بجائے ان کے عوض خود خریداری کر لیتے تھے۔اب منظر کچھ یوں بنا کہ روم شہر میں تاجروں کا تمام تر سامان شہر کے داخلی

دروازوں پر چوبی بنچوں پر بیٹھے ہوئے یہودیوں کے پاس جمع رہتا اور ان کے عوض جاری کردہ رسیدوں پر ہی شہر میں بازار کا لین دین ہونے لگا۔ لاطینی زبان اور اطالوی میں بینچ کو ''بانکو'' کہتے ہیں۔ سامان جمع کر کے رسید جاری کرنے والے بنچوں پر بیٹھے ہوئے یہودیوں کو ''بانکو'' کہا جانے لگا۔ انگریزی زبان میں جا کر یہ بنک ہو گیا۔ جبکہ یورپ کی زیادہ تر زبانوں میں یہ اب بھی ''بانکو'' ہی کہلاتا ہے۔ یہیں سے جدید بنکاری کی ابتداء اور کرنسی کا بنیادی خیال پروان چڑھا تھا۔ پھر یہ نظام دوسرے شہروں اور دیگر ممالک تک پھیل گیا۔ اس تاریخی واقعے کا یہ پہلو بھی دلچسپ ہے کہ یہ یہودی شہر کے دروازوں پہ ہی کیوں بیٹھے تھے؟ تاجر یا خریدار ان کے گھروں پر ہی کیوں نہیں چلے جاتے تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر تاجر اور خریدار عیسائی مذہب کے پیروکار تھے۔ اور یہودیوں کے گھر جانا ناپاک خیال کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کھانا، پینا حرام سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان یہودیوں کو اپنا اڈا گھر اور بازار سے ہٹ کر چوبی بنچوں پر جمانا پڑتا تھا۔ عیسائی تاجروں کی یہودیوں کو ناپاک سمجھنے کی وجہ بنی اسرائیل کا حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کروانا تھا۔ یورپ میں بار ہا یہودیوں کی بے دخلی کی وجہ انکا معیشت پر کنٹرول اور یہی واقعہ بنا تھا۔ جس کی آخری جھلک ہم نے جرمنی میں ایڈولف ہٹلر کے دور میں دیکھی۔ یہودی نسل در نسل معیشت میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی تو امریکہ میں وال سٹریٹ کی بنیاد بھی نیویارک آنے والے انہی یہودیوں نے رکھی اور آہستہ آہستہ مالیاتی شعبے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ترکی کے مسلمان خلیفہ نے ایک بار سپین سے بے دخل کیے گئے، یہودیوں کو اپنے ملک میں لانے کے لیے بحری جہاز بھیجا تھا اور انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے یہ جملے کہے تھے کہ کوئی شہر اس وقت تک شہر ہی نہیں بنتا جب تک اس میں یہودی موجود نہ ہوں۔
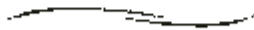
# گفتگو کے آداب

عہد ساز چینی ماہر نفسیات جنگ کے پاس دو پاگل پروفیسروں کو لایا گیا۔ نامور فلسفی اور نفسیات کے ماہر جنگ گستاؤ نے انہیں اپنے کلینک میں داخل کرلیا اور ان کا مشاہدہ کرنے لگا۔ دونوں پروفیسر جب آپس میں بات کرتے تو ان میں کوئی بھی تال میل نہ ہوتا۔ایک پروفیسر اگر آسمان کی بات کرتا تو دوسرا زمین کی ،ایک پاگل پروفیسر مشرق کی بات کرتا تھا تو دوسرا مغرب کا تذکرہ یعنی بالکل ہی بے جوڑ گفتگو۔مگر ایک بات غیر معمولی تھی ،جب ایک پروفیسر بات کرتا تھا تو دوسرا خاموش رہتا، جب پہلا اپنا بیان مکمل کرلیتا تو پھر دوسرا گویا ہوتا۔جنگ کے لئے یہ صورت حال غیر معمولی تھی۔اس نے اپنی زندگی میں ہزاروں ذہنی امراض میں مبتلا افراد کا مشاہدہ کیا تھا مگر یہ کیس بے نظیر تھا۔اس نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے متذکرہ پروفیسروں سے سوال کیا کہ جب آپ کی باتوں میں کوئی باہمی تعلق، واسطہ ہی نہیں ہے،تو پھر خاموشی اور توجہ سے آپ ایک دوسرے کی بات کیوں سنتے ہیں،اور اپنی باری پر ہی کیوں بولتے ہیں؟ اس پر پروفیسروں نے یک زبان ہوکر جواب دیا، کہ آپ کیا سمجھتے ہیں ہمیں گفتگو کرنے کے آداب نہیں پتا؟

ان دنوں یہ کہانی نما واقعہ مجھے اکثر پاکستانی ٹیلی ویژن ٹاک شوز دیکھ کر یاد آجاتا

ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ گفتگو کے جن آداب کا مظاہرہ پاگل پن کی حد کو پہنچے ہوئے پروفیسروں نے چینی ماہر نفسیات کے کلینک میں کیا تھا، اکثر ہمارے نیوز چینلز پر مدعو،نیم دانشورٹاک شوز کے دوران گفتگو کے ان آداب کوملحوظ خاطرنہیں رکھتے ہیں۔دفاع میں یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ مذکورہ پروفیسرتو پاگل تھے،میرا مقصد یہاں کسی ادارے یا طبقے پرتنقید کرنا قطعاً نہیں ہے، بلکہ ہمارے سماجی رویے میں پیدا ہوتی ہوئی ایک نئی خامی کی نشاندہی کرنا مقصود ہے۔روایتی طور پر ہم تحمل وبردباری سے بات کرنے اور سننے کے قائل ہیں،قطع کلامی کرنا ہمارے ہاں ہمیشہ سے گفتگو کے آداب کے منافی سمجھا جاتا رہا ہے،لیکن گزشتہ چند سالوں میں میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ وبا ہمارے ہاں تیزی سے پھیلتی جارہی ہے،کہ ایک آدمی اپنا مدعا بیان کررہا ہوتا ہے، اورہم اسے ٹوکنے لگتے ہیں۔اس بابت میں اس دلیل کا خریدار نہیں ہوں کہ وقت کی کمی کے پیش نظر یہ صورتحال درپیش ہے،تیز تیز بولنا پڑتا ہے اور بات کاٹنی پڑتی ہے۔زمانے کی رفتار ایسی ہے کہ وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔عرض یہ ہے کہ گھڑی کی رفتار پاکستان میں بھی بالکل ویسی ہے جودنیا کے دیگر دوسوممالک میں ہے ۔مزید برآں زندگی کی رفتارپاکستان میں یورپ یاجاپان سے زیادہ تیز ہرگزنہیں ہے۔یہاں بھی مکالمے اورمذاکرے بہت ہوتے ہیں،میڈیا پربھی اور سماجی سطح کے اوپر بھی ،کوئی تصوربھی یہاں نہیں کرسکتا کہ تین تین لوگ اکٹھے شور مچائیں اوراسے مذاکرے کانام دیا جائے۔قطع کلامی توسخت بدتمیزی شمار ہوتی ہے۔

امام علی رضاؑ کے مزار مقدس،مشہد گیا تو امامؑ کے بارے میں ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا،نبی آزادےؑ نے اپنی ساری زندگی میں کبھی کسی کا قطع کلام نہیں کیا،کسی شخص کی بات بیچ میں نہیں ٹوکی۔حتیٰ کہ کسی بچے کی بات بھی نہ کاٹی،میڈیا کا ذکر بار بار اس لئے آجاتا ہے کہ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ پورے عالم میں اخبار میں چھپے ہوئے حرفوں اورٹی

وی، ریڈیو پر دیکھی، سنی ہوئی باتوں کو لوگ معتبر مانتے ہیں۔ ان پر یقین کرتے ہیں۔ اظہار خیال کرنے والوں کو لوگ رول ماڈل اور ہیرو سمجھتے ہیں، ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے کے علاوہ ان کا اثر لیتے ہیں۔بعض سادہ دل لوگ نقالی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ہمارے یار طرحدار باواجی کا شکوہ ہے کہ پاکستانی میڈیا آزاد ہونے کے بعد اب بد تمیز ہو گیا ہے۔ پورے میڈیا کو بدتمیز قرار دینا تو خیر مبالغہ آرائی اور ناانصافی ہے، مگر میڈیا کے ہاتھوں سے تمیز و تہذیب کا دامن کھسکتا ہوا بھی جابجا صاف نظر آتا ہے۔ معاشرے پر جہاں اس کے ان گنت مثبت اثرات دیکھے جا سکتے ہیں، وہیں چند منفی پہلو بھی تو توجہ کے طالب ہیں۔

اعلیٰ صحافتی اصولوں، قدروں کی کتابی و نصابی باتیں تو میں نہیں کروں گا، کہ مجھ سمیت اکثر شعبہء صحافت سے منسلک افراد نے نصابی تعلیم دیگر شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں حاصل کی ہے۔ بعد ازاں کوچہء صحافت کا رخ کیا ہے۔ مگر سکول کی چوتھی جماعت میں اردو کی کتاب کا سبق ''گفتگو کے آداب'' تو بلا مبالغہ ہمارے شعبے کی غالب اکثریت نے ضرور پڑھا ہوگا۔ ہمیں اس سبق کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اخلاقیات کوئی دقیق، ثقیل اور مشکل موضوع نہیں ہے، دنیا بھر میں ادب و آداب بنیادی طور پر وہی سادہ باتیں ہیں جو ہم بچپن میں اپنی ماؤں، نانیوں اور دادیوں سے سنیں تھیں، اور جواب بھی مائیں اپنے بچوں کو سکھاتی ہیں۔ انسان بے شک اشرف المخلوقات ہے، مگر دیگر مخلوقات اور حضرتِ انسان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حیوانات کو حیوانیت سیکھنا نہیں پڑتی، انسانوں کو انسانیت سیکھنا پڑتی ہے۔ جانور اگلی نسلوں کو اپنا علم و تجربات منتقل نہیں کرتے مگر ماضی کے علوم و اخلاقیات سے اکتساب انسانی ارتقاء کا سب سے اہم محرک ہے۔
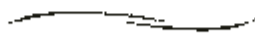
# ارون دتی رائے اور گاندھی جی

ہندوستان تو میں کبھی نہیں گیا، اور نہ ہی مستقبل قریب میں بھارت یاترا کا کوئی ارادہ وامکان ہے، مگر بھارتی اخبارات وجرائد میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ گزشتہ دو ہفتوں سے انڈین میڈیا معروف مصنفہ وسماجی کارکن ارون دتی رائے پر بڑی سخت تنقید کررہا ہے۔ برطانیہ کا سب سے اہم ادبی ایوارڈ ''بکرز پرائز'' حاصل کرنے والی اس خاتون پر بھارتی ذرائع ابلاغ کی تنقید کوئی نئی بات نہیں، ہندوستان میڈیا کی عمومی رائے ہے کہ ارون دتی رائے کو ہندوستان میں کوئی چیز اچھی نظر ہی نہیں آتی، جس کے جواب میں ارون دتی عموماً یہ کہتی ہے کہ بھارتی میڈیا اتنا معصوم ہے کہ اسے ستر ہزار بےقصور مارے جانے والے کشمیریوں کی قبریں نظر نہیں آتی ہیں۔ اس کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ دھان پان سی لڑکی، مگر اتنی جرات مندانہ باتیں کرتی ہے۔ شہرۂ آفاق ناول '' GOD OF SMALL THINGS '' سے عالمگیر شہرت اور بکرز انعام پانے والی، جو کہ عالمی سطح

پر ادب کے نوبل انعام کے بعد سب سے معتبر ادبی انعام ہے، اس خاتون کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ اس کا یہ تجزیہ تھا کہ ہم برصغیر پاک و ہند کے لوگ بڑے بڑے موضوعات پر بڑی بڑی باتیں کرنا پسند کرتے ہیں، روزمرہ کے چھوٹے موٹے موضوعات پر بات کرنا کسر شان سمجھتے ہیں، شاید اپنے ناول ''GOD OF SMALL THINGHS'' کا نام بھی اس نے اسی وجہ سے منتخب کیا ہوگا۔

اس بار ارون دتی رائے پر ہونے والی تنقید کی وجہ کیرالہ میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں اس کا خطاب ہے، جس میں دیگر باتوں کے علاوہ اس نے یہ کہا کہ گاندھی جی نے ذات پات کے نظام کو مضبوط کیا، ہندوستان میں چھوت، چھات کو فروغ دیا، اور درحقیقت گاندھی عدم تشدد میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ نیز ان کا عدم تشدد کا فلسفہ فقط ایک ڈھونگ تھا۔ بھارتی میڈیا اس کے خطاب کے اسی حصے کو بنیاد بنا کر ان پر تنقید کے نشتر چلا رہا ہے۔ ارون دتی رائے کے خوبصورت طرز تحریر اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اس کی جدوجہد کے سبب بہت سے دیگر لوگوں کی طرح میں بھی اس کا مداح ہوں۔ مگر اس مداحی کے سبب نہیں بلکہ تاریخ سے آگاہی کی وجہ سے میں موہن داس کرم چند گاندھی کے متعلق ارون دتی رائے کے تجزیے سے حرف بہ حرف متفق ہوں۔

بھارتی میڈیا جن دو باتوں کو لیکر ارون دتی رائے کو رگید رہا ہے، ان میں پہلی یہ ہے کہ گاندھی جی نے بھارت میں ذات پات کے نظام کو مضبوط کیا اور دوسری یہ کہ ان کا فلسفہ عدم تشدد فقط ڈھونگ تھا پہلے ذات پات کے نظام کو مضبوط کرنے کی بات کرتے ہیں، اس کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ انہوں نے ''شودر ذات'' کے لوگوں کے لیے ''ہریجن'' کا نیا لفظ ایجاد کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہزاروں سال سے ہندو دھرم میں پائے جانے والے فرسودہ، چار ذاتوں پر مبنی سماجی نظام سے تو متفق ہیں، بس پست ترین

قرار دی گئی ذات کا صرف لیبل بدلنا چاہتے تھے۔ اک ''ہریجن'' کی اصطلاح کے اجراء پر ہی موقوف نہیں، گاندھی جی کی آپ بیتی '' MY EXPERIMENTS WITH TRUTH''جس کا اردو ترجمہ ''تلاش حق'' کے نام سے بازار میں دستیاب ہے، اس کے ہر صفحے پر آپ کو ذات پات کا محافظ ایک برہمن شخص نظر آئے گا۔ گاندھی جی، جنہیں ہندوستان میں ''مہاتما گاندھی'' اور ''باپو'' بھی کہا جاتا ہے، ذات پات کی تقسیم کا حامی ہونا تو ان کے اپنے تحریر کردہ الفاظ سے صاف ظاہر ہے، اس باب میں کسی اور ثبوت کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔

جہاں تک عدم تشدد کے فلسفے کا تعلق ہے تو گاندھی جی کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ''ڈھونگ'' سے زیادہ مناسب لفظ تلاش کرنا شاید ممکن ہی نہیں ہے۔ جس تجزیے کے سبب ارون دتی رائے ہدف تنقید بنی ہوئی ہے، سچ پوچھیں تو وہ داد کی مستحق ہے۔ آج سے ہی بات شروع کرتے ہیں، اگست کا مہینہ اس برس یوں بھی اہم ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے آغاز کو اس ماہ ایک صدی مکمل ہونے جا رہی ہے۔ سن 1914 میں شروع ہونے والی اس جنگ میں دس لاکھ سے زائد برصغیر کے رہنے والے فوجی شریک ہوئے، اور برطانوی کمان میں دنیا بھر کے محاذوں پر انگلستانی فوجیوں کے شانہ بشانہ لڑے۔

یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانی فوجیوں کی تعداد برطانوی فوجیوں سے تیس فیصد زیادہ تھی۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت اور غیر متنازعہ بات ہے کہ گاندھی جی نے برصغیر کے لوگوں کو اس جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دینے کی بھرپور وکالت کی تھی، فقط اتنا ہی نہیں، رائل برٹش آرمی میں بھرتی ہونے کے لیے چلائی جانے والی مہم کا گاندھی جی بہت اہم حصہ تھے، فوجی بھرتی کے لیے ان کی جانب سے چلائی جانے والی اس پر اثر مہم کے اعتراف میں انہیں کئی سرکاری اعزازات سے نوازا گیا۔ گاندھی کا استدلال

تھا کہ برطانوی فوج میں بھرتی اور جنگ لڑنے کی وجہ سے بھارتی عوام کو جدید عسکری تربیت حاصل ہوگی اور وہ صدیوں پرانے اپنے مارشل ورثے کی تجدید کر سکیں گے، گاندھی جی کا استدلال اگر مان بھی لیا جائے، پھر بھی یہ عدم تشدد کے فلسفے سے متصادم رویہ ہے۔

ایک ممتاز بھارتی مذہبی پیشوا نے گاندھی کے بارے میں بڑی ''بے رحم'' رائے کا اظہار کیا ہے، اس کا کہنا تھا کہ ''گاندھی انسانی تاریخ کا سب سے مکار سیاستدان تھا'' دلائل کے طور پر مذکورہ مذہبی پیشوا نے اپنی کتابوں کے انبار لگا رکھے ہیں، مگر ایک اہم بات اس نے ہمارے موضوع سے متعلق کہی ہے، اس روحانی پیشوا کا ماننا ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح کانگرس سے اس وجہ سے الگ ہوئے کیونکہ گاندھی جی نے تحریک خلافت کی حمایت کر دی تھی۔ یاد رہے کہ قائد اعظم تحریک خلافت کے حامی نہیں تھے۔ متذکرہ روحانی پیشوا کے نزدیک جب گاندھی جی نے تحریک خلافت کی حمایت کا اعلان کر دیا تو قائد اعظم اس شخص سے ڈر گئے تھے، کہ یہ تو بہت خطرناک آدمی ہے ترکی میں خلیفہ رہتا ہے یا نہیں رہتا، اس با ت سے ایک بھارتی ہندو برہمن کا کیا لینا دینا ہے؟

سچی بات یہ ہے کہ دلیل میرے دل کو لگی ہے، یوں تو بعد از اں چورا چوری کی مسجد سے متعلق ہونے والے پر تشدد واقعے کو بہانہ بنا کر گاندھی جی اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے تھے، مگر قائد اعظم کا ان پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا؛ ان کے نزدیک گاندھی ایک مکار سیاستدان ثابت ہو چکا تھا۔ اسی لیے تحریک خلافت سے کانگریس کی علیحدگی کے باوجود قائد اعظم نے کانگریس کو خیر باد کہہ دیا۔

اگر آج تاریخ کے مطالعے سے ارون دتی رائے بھی اسی نتیجے پر پہنچی ہے جس پر قائد اعظم عشروں پہلے پہنچے تھے، کہ گاندھی کا عدم تشدد کا فلسفہ محض ایک ڈھونگ ہے۔ تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں ہے۔ میرے کئی دوست گاندھی کی سادگی اور خود چرخہ چلا کر،

سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی تعریف کرتے ہیں، کچھ لوگ تو قائداعظم کو مغربی لباس اور جدید طرز زندگی اپنانے کے سبب ہدف تنقید بناتے ہیں۔ جہاں تک چرخہ کاتنے کا سوال ہے تو اتنا کہوں گا کہ اس وقت کو کیا عوام کی بہبود کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا، اور اپنے کپڑے بننے کا کام تو وہ کسی بھی غریب جولا ہے سے سستے داموں کروا سکتے تھے۔ باقی رہا سوال سادگی کا، تو میں سمجھتا ہوں کہ لیڈر کی سادگی کا نتیجہ اس کے ملک کی غربت کی صورت میں نکلتا ہے۔ لیڈروں کا سادگی پر اصرار ہمیشہ دیس میں غریبی ہی لیکر آیا ہے۔ قائداعظم کے لباس اور وضع قطع کی بات کریں تو مختصر یہی عرض کروں گا کہ وہ جیسے اندر سے تھے، ویسے ہی باہر سے نظر آتے تھے، انکا ظاہر، باطن ایک تھا، ان کی شخصیت میں بناوٹ، ڈھونگ اور پاکھنڈ کا الزام تو ان کے شدید ترین مخالفین نے بھی نہیں لگایا۔ دوسری طرف اگر ارون دتی رائے گاندھی جی کے رویے کو ڈھونگ قرار دیتی ہے تو اس بیان کے حق میں بہت سارے تاریخی شواہد موجود ہیں۔
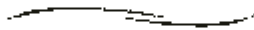
# دو کتابیں

امریکہ میں مقیم معروف ادیب اور دانشور کے۔اشرف کا سفرنامہ ''اسرائیل میں چندروز'' کئی لحاظ سے منفرد اور بے مثال ہے۔کے۔اشرف پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے اسرائیل کا سفرنامہ لکھا ہے۔اسرائیل کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لئے اسرائیل کا سفر کرنا ممکن نہیں ہے،اور اگر کچھ پاکستانی وہاں گئے بھی ہیں تو وہ اہلِ قلم نہیں تھے۔یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی جسے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور بھی کہا جاتا ہے،اس عہد میں بھی اسرائیل کے متعلق عام پاکستانی کی معلومات بہت ہی کم ہیں۔معلومات سے یہاں میری مراد ان کے رہن سہن کے متعلق باتیں ہیں اور ان باتوں میں بھی چاشنی تبھی ہوتی ہے جب کوئی آپکا ہم وطن وہم زبان یہ بیان کررہا ہو۔اسرائیل میں ایک پاکستانی کو جو تجربات ہوئے اس کا بیان بلاشبہ اردو زبان کے قارئین کے لئے ایک منفرد تحفہ ہے۔کتاب کا انتساب غریب فلسطینیوں کے نام کیا گیا ہے جو اپنے وطن میں ہی غریب الدیار ہیں۔اس سفرنامے کا ایک امتیاز اس میں شامل رنگین

تصاویر ہیں جن سے کتاب کا مزہ ، دو آتشہ ہوگیا ہے۔ انتہائی اعلیٰ طباعت اور خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ "اسرائیل میں چند روز۔۔۔۔!" کیلی فورنیا کے شہر برکلے سے شائع ہوئی ہے۔کے۔ اشرف بھی گزشتہ تین دہائیوں سے برکلے میں ہی مقیم ہیں۔امریکہ جلا وطن ہونے سے پہلے وہ پاکستان میں کالج پروفیسر تھے۔ترقی پسند خیالات اورتحریروں کی وجہ سے آمر جنرل ضیاءالحق کے عتاب کا شکار رہے اور جلا وطنی اختیار کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔کئی ناول تصنیف کئے، اس کے علاوہ افسانہ نگاری وشاعری تو ان کی پہچان پہلے سے تھی، اب سفر نامہ نگاری میں بھی ان کا معتبر حوالہ بن گیا ہے۔سادگی وسلاست کے ساتھ ساتھ واقعات میں تسلسل اورتحریر کی روانی قاری کو "اسرائیل میں چند روز" پڑھتے ہوئے اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ کتاب ختم کرنے سے پہلے اسے رکھنے کو جی نہیں کرتا۔ایک خاص بات جس نے مجھے متاثر کیا وہ یہ ہے کہ مصنف نے تاریخ کی بھول بھلیوں میں کھونے کی بجائے آج کے دور پر توجہ مرکوز رکھی ہے اور تاریخ کے حوالے صرف وہیں دیئے ہیں جہاں ناگزیر تھے۔حالانکہ یروشلم کے سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے یہ قرین قیاس تھا۔کتاب کے نام پر ایک ممکنہ اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ اس کا نام "فلسطین میں چند روز" کیوں نہیں ہے۔مصنف نے اس کا بڑا تسلی بخش اور سادہ جواب دیا ہے کہ میرے پاسپورٹ پر ویزہ اور مہر اسرائیل کی لگی ہے اس لئے بہتر نام یہی لگتا ہے "اسرائیل میں چند روز" سیانے کہتے ہیں کہ جب آدمی کو محبت ہوجائے تو اس کی زندگی نثر سے شعر میں داخل ہوجاتی ہے۔دوسری کتاب جس پر میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں وہ شاعری کی ہے۔میرے لئے یہ اعزاز اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ دونوں مصنفین سے میرا دوستی اور محبت کا رشتہ ہے، میری جنم بھومی سے تعلق رکھنے والے اس تازہ کار شاعر کے کلیات حال ہی میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔زمیندار سیاسی گھرانے سے تعلق رکھنے والے اسد عباس اسدؔ پیشے کے اعتبار سے قانون دان ہیں۔اس پس منظر کا

بظاہر شاعری کے ساتھ کوئی تال میل بیٹھتا تو ہرگز نہیں ہے مگر انہیں ملنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اصل میں تو وہ سرتاپا صرف شاعر ہیں، باقی سب کچھ محض اتفاقات ہیں۔

شعروادب کی دنیا میں یہ بات قابل ستائش اور باعث فخر سمجھی جاتی ہے، اگر شاعر کے خاندان میں شعری روایت موجود ہو اور بزرگوں میں بھی شعراء اور ادباء گزرے ہوں۔ ذاتی طور میں نے کئی بارسکہ ادیبوں کی جانب سے اپنے بزرگوں کی شعروسخن سے نسبت کی بابت سوال کا سامنا کیا ہے۔ پہلی نسل کے سخنوروں کو تو بعض رجعت پسند اہل قلم گھس بیٹھیے تصور کرتے ہیں۔ میری رائے قدامت پرست اہل حرف سے قطعی مختلف ہے میرے نزدیک مہاتما بدھ کا محل چھوڑ کر جنگل میں جابسنا زیادہ حوصلہ مندی اور ہمت وجرات کی بات ہے۔ بہ نسبت جنگل کے اس باسی کے جو پیدا ہی جنگل میں ہوا ہے۔ ایک ہی جنگل میں رہتے ہوئے بھی مہاتما بدھ یا پھر جین مت کے بانی مہاویر کے نزدیک جنگل کے معنی ومطلب کچھ اور ہیں کیونکہ وہ بادشاہی اور محلوں کی زندگی ٹھکرا کر آئے ہیں، ان کے مقابلے میں جنگل میں جنم لینے اور وہیں پروان چڑھنے والے باسیوں کے نزدیک اسی جنگل کا مفہوم بالکل مختلف ہے۔ میرے نزدیک مہاتما بدھ کا جنگل میں رہنا اور اسد عباس اسد جیسے نوجوان کا شاعری کرنا زیادہ عظمت اور حوصلے کی بات ہے۔

انتہائی ملنسار اور خوش اخلاق ہونے کے علاوہ اسد جس محبت اور وفا کا اپنی شاعری میں پرچار کرتے ہیں، خود بھی اسی چاہت وخلوص کی عملی طور پر جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ ہم شاعر لوگ محبت کے اشعار کہتے ہیں مگر جامہ تلاشی میں اگر ہم سے الفت کی ایک رتی بھی برآمد نہ ہو تو ہمارے تمام تخلیقی عمل پر بہت بڑا سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ جس وفاداری کو استواری کی شرط پر ہم لوگ ایمان کا اصل واصیل بیان کرتے ہیں۔ ہماری زندگی میں بھی وہ کمٹمنٹ نظر آنی چاہئے۔ اسد عباس اسد کی حساسیت شاعری میں بھی جگہ جگہ نمایاں ہے اور

ان کی شخصیت بھی ان کے فن کا پرتو محسوس ہوتی ہے۔

نجانے کون تھا لیکن چراغوں کے اجالوں پر
کسی آنچل کا سایہ تھا، بچھڑنے سے ذرا پہلے
تیرا ذکر ہے میری گفتگو تیرا عکس ہے میری کائنات
ترے بعد کیا میری زندگی مجھے زندگی کی دعا نہ دے

وہ ہونہار اور تازہ کار شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں قوس قزح کے سارے ہی رنگ موجود ہیں۔ان کی شاعرانہ اندرِ دلکشش کا یہ رنگ ذرا ملاحظہ ہو

پہلے میں قتل کیا جاؤں گا بے دردی سے
پھر میرے خون سے تحریر لکھی جائے گی

اتنی کم سنی میں کلیات کا شائع ہونا عمر سے بڑی بات لگتی ہے لیکن فارسی مقولے کے مصداق عمر بہ عقل است، نہ بہ سال جہانِ فن میں تو ویسے بھی عمر کو تخلیقی معیار و مقدار سے ماپا جاتا ہے، ماہ و سال سے نہیں۔''دشتِ وفا'' پانچ شعری مجموعوں پر مشتمل دیوان ہے۔ان کلیات کو میں تو اسد عباس اسد کی محبت کے پانچ موسم اور وفا کے پانچ رنگ قرار دوں گا۔ابتداء سے لے کر آخر تک شعری سفر کے مطالعے سے میں نے اس کے فنی ارتقاء کا سفر بھی محسوس کیا ہے۔اس نے جذبات کی جس فراوانی کے ساتھ پہلے شعری مجموعے کو تخلیق کیا، آخری شعری مجموعے میں بھی جذبات کا وہی ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی

دیتا ہے۔ہاں! اس سارے سفر میں لحہ بہ لحہ فنی پختگی آتی دکھائی دیتی ہے۔

اسد نے معروف ومقبول زمینوں میں بھی چونکا دینے والے اشعار کہے ہیں۔ انہوں نے خیال کی رعنائیوں اور جذبوں کے حسین امتزاج سے اچھوتا شعری رچاؤ پیدا کیا ہے۔محبت ان کی شاعری کا بنیادی،موضوع ہے مگر سماج سے بھی وہ لاتعلق نہیں بلکہ کئی جگہ محبت اور معاشرتی موضوعات کی آمیزش سے تخلیقی عمل انجام دیتے نظر آتے ہیں۔یہ شعر ذرا دیکھیے

لوگوں نے ستانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی
ہم اہلِ مروت تھے بھلا مانگتے رہے

سیاست کے موضوع کو بھی وہ شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھتے ،اس کی خوبصورت مثال ان کی محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت پر لکھی گئی نظم ''اے شاہ زادی کے سوگوارو'' ہے۔ذرا اس شعر کا طنطنہ ملاحظہ ہو۔

مرے حاکم کو تب انکار پہنچا
مرا سر جب سرِ دربار پہنچا

کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اسد کی وارداتِ قلبی میں دریائے راوی کے کناروں کی مٹی کا بھی بڑا گہرا اثر ہے۔دریائے راوی کے کنارے بسنے والے ہم لوگ طبعاً غیر متشدد،امن پسند اور پیار کرنے والے واقع ہوئے ہیں،رومانیت پسندی ہماری مٹی میں رچی بسی ہے۔

بہت گہرا تھا دریائے محبت
اسدؔ میں سب لٹا کر پار پہنچا
اس سے نظر چرانا بھی ممکن نہ تھا اسدؔ
لیکن اسے قریب سے تکنا محال تھا

میری دعا ہے کہ ''دشتِ دعا'' کی اشاعت کے بعد اسد عباس اسدؔ کا شعری سفر جاری وساری رہے اور محبت کی شاعری میں یہ مجموعہ کلام ایک اہم حوالہ بنا رہے۔

# رُخسانہ نور کی رُخصتی

معروف شاعرہ، صحافی، ادیبہ اور فلم رائٹر رخسانہ نور اب ہم میں نہیں رہیں۔ انہوں نے کینسر کے موذی مرض کا بڑا طویل عرصہ، انتہائی بہادری اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بالآخر گزشتہ روز اٹھاون سال کی مختصر عمر میں زندگی کی بازی ہار گئیں۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ ''آ پیار دل میں جگا'' کے نام سے شائع ہوا تھا اور شعری مجموعہ ''الہام'' کے نام سے طباعت پذیر ہوا۔ ان دنوں ان کا ایک اور شعری مجموعہ زیر طباعت تھا، جس کا اہتمام میرے ادیب دوست ڈاکٹر صغرا صدف اور حسن عباسی کر رہے ہیں۔

رخسانہ نور نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز روزنامہ جنگ سے بطور فیچر رائٹر کیا تھا۔ شوہر نامدار فلمساز سید نور سے ان کی پہلی ملاقات بھی روزنامہ جنگ کیلئے کیے گئے ایک انٹرویو کے سلسلے میں ہی ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ رخسانہ آرزو کے نام سے لکھا کرتی تھیں۔ سیالکوٹ ضلع کے علاقے پسرور میں پیدا ہوئیں مگر بعد ازاں ان کا خاندان لاہور منتقل ہو

گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات سے انہوں نے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی تھی۔ بتا یا کرتی تھیں کہ شعبہ ابلاغیات سے جب انہوں نے ایم۔اے کیا تو اسی وقت شعبہ جرنلزم کے صدر نے انہیں اسی شعبے میں پڑھانے کی پیشکش کی تھی۔ اس وقت انہوں نے بوجوہ یہ آفر قبول نہیں کی۔ مگر ازراہ تفنن کہا کرتیں کہ میں نے شعبہ ابلاغیات میں پڑھانے کی نوکری والی آفر قبول کرنے میں پچیس سال لگا دیے۔ پڑھنے، لکھنے سے رخسانہ کو عشق تھا۔ جب پنجاب یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا تو اکثر کہتی کہ پڑھنے، پڑھانے سے اچھا کام اور کوئی بھی نہیں، یہ دنیا کا افضل ترین کام ہے۔

پنجاب یونیورسٹی میں تدریس کا کام انہوں نے غالباً فلمساز سید نور کی اداکارہ صائمہ کے ساتھ دوسری شادی کے بعد شروع کیا تھا۔ سید نور کی دوسری شادی کا انہیں شدید صدمہ تھا۔ مگر کسی کے سامنے ایک حرف بھی شکایت کا ان کی زبان پر نہیں آیا، انہوں نے فلمساز سید نور کو اپنی آخری سانس تک مجازی خدا ہی بنا کر رکھا۔ البتہ اس واقعہ کے بہت دن بعد تک ان کی آنکھیں روئی ہوئی لگتی تھیں۔ اداکارہ صائمہ کے پس منظر کو جتنا بھی مہذب اور ملفوف الفاظ کا لبادہ اوڑھا دیا جائے وہ بہر حال رخسانہ نور جیسا تو قطعاً نہیں تھا۔ فلمی پس منظر کا علمی پس منظر سے موازنہ یا مقابلہ میرا مقصد نہیں۔ ہمارے ہاں عموماً یہ مختلف شعبہ جات سمجھے جاتے ہیں۔ فلمی پس منظر کو حقیر کیسے کہہ دوں کہ رخسانہ نور نے خود درجن سے زیادہ سپر ہٹ فلموں کا اسکرپٹ لکھا تھا، جن میں، لڑکی پنجابن، چوڑیاں، مجاجن، جھومر، دوپٹہ جل رہا ہے، سنگم، مہندی والے ہتھ، ناگ اور ناگن اور اس کے علاوہ بھی ایک طویل فہرست ہے۔

فلمی دنیا کو عالمی طور پر تصنع، رنگ وروغن اور جھوٹ کی دنیا سمجھا جاتا ہے، جو پل پل رنگ بدلتی ہے، یہ تاثر بڑی حد تک درست بھی ہے، مگر اتنی ساری ہٹ فلمیں کرنے کے

باوجود رخسانہ نور پر تو فلمی دنیا کی ان قباحتوں کی پرچھائی تک نہ تھی۔ تصنع تو اسے چھو کر بھی نہ گزرا تھا اور ایسی بے دریغ سچ بولنے والی شخصیات تو میں نے اپنی زندگی میں کم کم ہی دیکھی ہیں جیسی رخسانہ تھی، عجز و انکساری مثالوں جیسی اور نرم خو طبیعت ایسی کہ تصور کرنا مشکل تھا کہ انہیں غصہ کیسے آتا ہوگا؟ ظرف اور دل میری اس دوست کے دونوں ہی اعلیٰ و بے مثال تھے، سب کو معاف کر دینے کا حوصلہ اور ہمت رکھتی تھیں۔ ایسا حوصلہ اس زمانے میں ملنا بڑی مشکل بات ہے۔

سنا ہے عورتیں عموماً بڑی غیبت پسند ہوتی ہیں مگر دوستوں کے کان ترس جاتے کہ رخسانہ نور کے منہ سے بھی کسی کی غیبت سنیں، دوستوں کا تو ذکر ہی کیا، دشمنوں کی بھی وہ غیبت کرنا گوارا نہ کرتی تھیں۔ اٹھاون سال کی مختصر مگر بامعنی زندگی گزارنے والی رخسانہ نور نے پسماندگان میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا ہے۔ پاکستان کی ادبی اور صحافتی برادری ایک مخلص دوست اور ہمدرد ساتھی سے محروم ہوگئی ہے، علمی و ادبی حلقوں میں ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی پورا نہ ہو سکے۔ گو کہ ان کی خوبصورت شاعری اور تحریریں ہمارے ساتھ ہیں مگر پھر بھی رخسانہ نور کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔
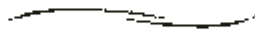
# تلسی داس اور تھامس پیکیٹی

آج کے دن ہی کی بات نہیں ہے، پچھلے کئی مہینوں سے دنیا بھر میں کسی بھی زبان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب فرانسیسی ماہر معاشیات تھامس پیکیٹی کی تحریر کردہ ''اکیسویں صدی میں سرمایہ'' ہے۔اس کتاب نے حقیقی معنوں میں مغربی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے، امریکہ میں فروخت کا ریکارڈ توڑنے والی یہ کتاب، جب صرف فرانسیسی زبان میں ہی شائع ہوئی تھی، تب سے ہی اس کا تقابل کارل مارکس کی عہد ساز کتاب ''داس کیپٹال'' سے ہو رہا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ''بیسٹ سیلر'' کتابیں کبھی بھی میری پسندیدہ کتب میں شامل نہیں رہیں۔ظاہری سی وجہ یہ ہے کہ ہومر، شیکسپیئر، پشکین ہوں یا پھر فردوسی، فرید، داود اور بلھے شاہ، ان میں سے کبھی بھی کوئی بیسٹ سیلر'' نہیں رہا۔پاؤلو کوہیلو کو میں استثنیات میں سمجھتا ہوں، یہ برازیلی لکھاری نہیں جادوگر ہے۔مگر پاؤلو کوہیلو کے ایک ہم وطن اور قریبی ملنے والے نے، جو کہ میرا بھی جاننے والا ہے، یہ کہہ کر دل ہی کھٹا کر دیا کہ ''وہ

تھوڑا سا مغرور ہے، میں! میں! ! بہت کرنے لگا ہے"۔

بھلے یہ غیر ادبی رویہ ہی سہی، میرا نظریہ ہے کہ اچھا لکھاری ہونا بلاشبہ ایک بڑی خوبی سہی، مگر اچھا انسان ہونا اس سے بھی بڑی اور بنیادی خوبی ہے۔ محبت کی باتیں لکھنے والے کی ذات میں اگر محبت ڈھونڈنے سے رتی بھر بھی برآمد نہ ہو تو اس کا تمام تخلیقی و تحریری عمل مشکوک ہے۔ جب تھامس پیکٹی کو "اکانومسٹ" جیسے معتبر جریدے نے عہد جدید کا کارل مارکس قرار دے ڈالا اور "وال سٹریٹ جرنل" اس کے طرز تحریر کو جارحانہ اور اس کتاب کو سرمایہ دارانہ نظام پر حملے سے تعبیر کرنے لگا، تو پھر میں نے سوچا کہ پچیس ڈالر کا کڑوا گھونٹ بھر ہی لیا جائے، جو کہ اس کتاب کا زرِ خرید ہے۔ میں اسے آن لائن کتب بیچنے والی سب سے بڑی کمپنی ایمازون سے خرید ہی لیتا، مگر میرے سٹاف نے یہ کمال کیا کہ انٹرنیٹ سے یہ کتاب مفت ہی ڈاؤن لوڈ کر کے مجھے دے دی۔ بائیں بازو کے دانشوروں کی طرح میں بھی کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کو غیر اخلاقی نہیں سمجھتا ہوں۔

سات سو صفحات انگریزی زبان میں، پھر اس پہ یہ ستم کہ موضوع بھی معاشیات جیسا خشک، ایسی کتاب شروع کرتے ہوئے ایم سی پرائمری سکول کے فارغ التحصیل طالب علم کا خوف زدہ ہونا لازمی امر تھا، مگر جب مطالعہ کرنا شروع کیا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سادہ زبان میں بڑی سادہ سادہ سی باتیں لکھی ہیں۔ کتاب کا خلاصہ چند لفظوں میں بیان کروں تو یہ ہے کہ دولت فطرتی اعتبار سے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کا رجحان رکھتی ہے۔ سرمایہ اس جگہ جانا پسند کرتا ہے جہاں وہ پہلے سے موجود ہو۔ اگر ریاست مداخلت نہ کرے تو سرمائے کے اس بہاؤ کو چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ مزید برآں ملکی معیشت کی شرح نمو کی نسبت ذاتی دولت بڑھنے کی شرح کہیں زیادہ ہے۔ آمدن اور دولت کی تقسیم ہی اس کتاب کا بنیادی موضوع ہے۔ دنیا بھر میں امیر اور غریب کے درمیان دن

بدن بڑھتی ہوئی خلیج نے اس کتاب کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا ہے ۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار پندرھویں صدی عیسوی کا ہندوستانی شاعر تلسی داس یاد آتا رہا۔ رامائن کو دورِ جدید سے ہم آہنگ سنسکرت زبان میں منتقل کرنے اور ہنومان چالیسہ تحریر کرنے کے سبب تلسی داس کو ہندو دھرم میں ایک مذہبی عقیدت بھی حاصل ہے۔ اس کا یہ شعر فوک وزڈم بن کر صدیوں سے ہند سندھ کی فضاؤں میں ضرب المثل کی صورت گونج رہا ہے۔

مایا سے ملے مایا، کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

حیران ہوں کہ پانچ صدیاں پہلے تلسی داس نے وہ بات کیسے کہہ دی جو تھامس پیکٹی آج کہہ رہا ہے۔ یہ لفظ مایا بھی خوب ہے، اس میں معنویت دولت اور مال سے بہت زیادہ ہے۔ کہتے ہیں، سب مایا کا جال ہے، سب مایا، اس کا مطلب قطعاً یہ نہ لیجیے کہ دنیا سرمائے کے دم قدم سے ہے۔ سنسکرت لغت میں اس کا لفظی ترجمہ تو ''خواب'' ہے مگر اسے بہت سارے دیگر معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے سندھی زبان کا لفظ ''سائیں'' ہے۔ اور عربی زبان کا لفظ ''مولا'' کثیر المعنی ہے، ''مولا'' کے لغت میں سترہ مطالب درج ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کیسے شاعر کی چشم تصور بعض اوقات وہ سب کچھ بہت پہلے دیکھ لیتی ہے جسے عام لوگ دیکھنے سے محروم ہوتے ہیں۔ تبھی تو غالب قطرے میں دجلہ دیکھ لیتے ہیں اور علامہ اقبال پاکستان کا تصور دیتے ہیں۔

''اکیسویں صدی میں سرمایہ'' نامی اس کتاب کے ہمارے مستقبل پر کیا اثرات ہوں گے؟ یہ سوال بہت اہم ہے مگر اس کا حتمی جواب دینا مشکل ہے۔ کارل مارکس کی تحریر

کردہ کتاب "سرمایہ" جب 1867ء میں پہلی مرتبہ جرمن زبان میں شائع ہوئی تو اس کا ایک ہزار کتب پر مبنی پہلا ایڈیشن فروخت ہونے میں پانچ سال لگ گئے تھے۔ انگریزی ترجمہ تو کہیں بیس برس بعد شائع ہوا تھا مگر اس کے بعد جو ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔
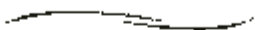
# مے کدے کا سبق

مے خانے کی حیثیت لاطینی امریکہ کے سماج میں کم وبیش وہی ہے جو ہمارے ہاں چائے کے کھوکھے کی ہوتی ہے۔سمندر کے کنارے واقع ایک ایسے ہی مے خانے کے باہر بیٹھا، میں سرِ شام ابھرنے والے چاند کا نظارہ کر رہا تھا۔ایک طرف بحرالکاہل کی لہروں کا شور، جسے موسیقی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔دوسری طرف مٹیلے پہاڑ ایستادہ، پرشکوہ اور ہیبت انگیز مل جل کر ایسی رومانوی فضا بنا رہے تھے جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل کیا، ممکن ہی نہیں۔بیرے نے آ کر میری ٹیبل پر رکھی شمع روشن کی اور آرڈر لکھنے کے لئے مؤدب انداز میں میز کے کنارے کھڑا ہوگیا۔میں نے اسے الکوحل کے بغیر ''پریمابیرا کاک ٹیل'' لانے کے لئے کہا۔''پریمابیرا'' ہسپانوی زبان میں موسمِ بہار کو کہتے ہیں اور یہ ایک مقبول مشروب کا نام بھی ہے۔میرے ساتھ والی ٹیبل پر ایک بوڑھا شرابی اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ بنتِ انگور سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔میرا آرڈر سن

کر بڈھا تو گویا تڑپ اٹھا، اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: الکوحل کے بغیر ''پریا ہیرا'' کاک ٹیل ایسے ہی ہے جیسے رس کے بغیر گنا۔ یہاں تک آ گئے ہو تو پھر آدابِ مے کشی ہی سیکھتے جاؤ۔ کھلے آسمان کے نیچے ہوا کے تھپیڑوں سے ٹمٹماتی ہوئی شمعیں اور لوک گلوکار کی گٹار کے ساتھ لائیو پرفارمنس سمندر کے اس ساحل پر جسے ''غصیلی حسینہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے، ایسا دلآویز ماحول بنا رہی تھیں کہ بڈھے شرابی کی بات ذرا بھی بری نہیں لگی۔ جس پیار بھرے شرارتی لہجے میں اس نے یہ بات کہی تھی وہ کسی بھی صاحب دل کو بری لگ ہی نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی میری نظر میں باتوں سے زیادہ لہجہ اہم ہوتا ہے۔

بحر الکاہل کے ساحل پر ملا بڈھا مجھے آج یوں یاد آیا کہ بہت سے اہلِ قلم مریم نواز کے سیاست میں سرگرم ہونے اور بیروزگار نوجوانوں کے لئے قرضے کی سکیم کا سربراہ بنائے جانے پر تنقید کر رہے ہیں۔ دوسری جانب بلاول بھٹو زرداری کے سیاسی کردار کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ذاتی طور پر موروثی سیاست کا مخالف ہونے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ شریف فیملی کے بغیر مسلم لیگ اور بھٹو خاندان کے بغیر پیپلز پارٹی ایسے ہی ہے جیسے رس کے بغیر گنا اور مٹھاس کے بغیر شہد۔ اور بقول بڈھے شرابی کے الکوحل کے بغیر ''پریا ہیرا'' ہوتی ہے۔

اصول کی بات کی جائے تو اگر ٹیچر کی اولاد کا ٹیچر بننا معیوب نہیں، دوکاندار کا بیٹا دوکاندار بن سکتا ہے۔ کھلاڑیوں کے بچے کھیل کے میدان میں اپنا نام پیدا کر سکتے ہیں، اور کاشت کار کے بچے کاشتکار بن جائیں تو کوئی بری بات نہیں ہے تو پھر سیاست دان کی اولاد اگر سیاست کے میدان اترنا چاہے تو یہ کوئی ایسی بھی بری بات نہیں ہے۔ معیار تو اخلاق و کردار ہی کو مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کے آباؤ اجداد کا غیر سیاسی ہونا سیاست کے لئے اس کی نا اہلی کی بنیاد قرار نہیں دیا جانا چاہئے۔ بالکل اسی طرح کسی کے بزرگوں کا

سیاسی کردار سیاست میں داخلے کی ممانعت کی وجہ قرار دینا انصاف نہیں ہے۔ سیاست میں موروثیت کا اس حد تک تو میں بھی مخالف ہوں کہ جاگیردار کا جو بچہ عملی زندگی میں کبھی کچھ نہیں بن سکتا اور گھر میں سب سے نالائق ہوتا ہے، اسے اپنے حلقہ اثر کا استعمال کرتے ہوئے، سیاست میں لا کر لوگوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ مگر صلاحیت اور میرٹ کی بنیاد پر کوئی شخص اگر عوام کی نمائندگی کرنے کے لئے خود کو پیش کرتا ہے تو اسے پدرانہ سیاست کی بنیاد پر نا اہل قرار دینا بھی جائز نہیں ہے۔

امریکہ بہادر میں اگر جارج بش کے بعد اس کا بیٹا جارج ڈبلیو بش صدر بن سکتا ہے اور کلنٹن کے بعد اس کی بیوی ہیلری کلنٹن صدر بننے کی کوشش کر سکتی ہے، تو پھر شریف فیملی اور بھٹو خاندان کی نئی نسل میں سے اگر کوئی عوامی حمایت کی بنیاد پر سربراہ مملکت چن لیا جاتا ہے تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ دنیا کا کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں مخصوص خاندان جمہوری سیاست کے ساتھ اس طرح منسلک نہ ہوں جیسے ہمارے ہاں موجود ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ موروثیت سیاست میں اہلیت یا نا اہلی کی بنیاد نہیں ہونی چاہئے۔ چلتے چلتے عرض کرتا چلوں کہ جاپان کے موجودہ وزیر اعظم شنزو آبے کے دادا بھی دوسری جنگ عظیم کے ہنگام وزیر دفاع پیداوار تھے اور جنگ کے کچھ سال بعد جاپان کی وزارت عظمیٰ کے عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔
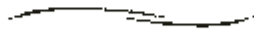
# کھیل ہی تو ہے

قومی کرکٹ ٹیم کو پاکستان کرکٹ بورڈ کی انتظامیہ سمیت ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی مار دینی چاہئے۔آج کل پاکستان کرکٹ ٹیم پر ہونے والی تنقید اور اصلاحِ احوال کے لئے پیش کی جانے والی تجاویز کا لب لباب کم وبیش یہی ہے۔مشکل مگر اس طریقہ علاج میں یہ ہے کہ اگر ہر ٹورنامنٹ میں ناکامی پہ یہی سزا برقرار رکھی گئی تو مستقبل میں کھلاڑیوں کو اس سے فائدہ ہونے کا امکان کم اور نقصان کا اندیشہ زیادہ ہے۔اس لئے عوام سے دست بستہ گزارش ہے کہ سزاؤں میں کچھ نرمیاں لے کر آئیں۔پاکستان کرکٹ ٹیم نے اپنے ابتدائی میچوں میں بری کارکردگی دکھائی ہے۔مگر قوم کے اتنی جلدی مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ورلڈ کپ 2015 میں کئی ممالک کی ٹیمیں ہم سے بھی بری کارکردگی کا مظاہرہ کررہی ہیں۔اور بعض ٹیموں کی کارکردگی ، جسے ناکارکردگی کہنا زیادہ درست ہے،ہم سے مماثلت رکھتی ہے۔

معین خان پر تنقید اس حوالے سے جائز ہے کہ انہوں نے بطور چیف سلیکٹر اچھی ٹیم کا انتخاب نہیں کیا۔ مثال کے طور پر یونس خان کی ٹیم میں جگہ نہیں بنتی تھی، سرفراز احمد اور یاسر شاہ سمیت کئی نوجوان کھلاڑی بہتر فارم میں تھے، انہیں کھیلنے کا موقع دینا چاہیے تھا۔ کچھ کھلاڑی ورلڈ کپ کی تیاری کے مرحلے میں ٹیم سے باہر رکھے گئے اور جب ٹورنامنٹ کھیلنے کا موقع آیا تو ان کو ٹیم میں شامل کرلیا گیا۔ یہ عقل سے بالاتر اور غیر منطقی طریقہ انتخاب ہے۔ جس پر معین خان کی سرزنش ہونی چاہیے تھی۔ ہمارے ہاں مگر تنقید کا زاویہ بالکل ہی مختلف اور کسینو چلے جانے کے حوالے سے ہے۔ اچھی خاصی تعداد میں چھپنے اور پڑھے جانے والی اردو اخبارات چیختی، چنگھاڑتی پانچ پانچ، چھ چھ کالمی شہ سرخیاں لگا رہی ہیں کہ معین خان کیسینو چلے گئے!! چیف سلیکٹر کی حیثیت سے ان کی ناکارکردگی کی بجائے کسینو تشریف لے جانے کی بنیاد پر انہیں کرکٹ بورڈ نے حکماً ٹورنامنٹ کے دوران واپس بلا لیا ہے۔ معین خان کے استعفیٰ اور وطن واپسی کی خبریں ایک ساتھ گردش میں ہیں۔ پاکستان میں کیونکہ کسینو نہیں ہوتے ہیں، اس لئے عوام الناس کے ذہن میں قمار خانے سے مراد گناہ گاروں کی جائے پناہ اور شیطانی کارخانے کا خیال ابھرتا ہے، جان کی امان چاہتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ مغربی دنیا میں کسینو کا مفہوم اس سے بہت مختلف ہے، جو ہمارے عمومی اردو اخبارات کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔ یورپ، شمالی وجنوبی امریکہ اور عالم کفر کے دیگر مراکز میں جو کسینو میں نے دیکھے ہیں، وہاں جوا کھیلنے والوں سے کہیں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو فقط تفریح طبع کے لئے آئے ہوتے ہیں۔ چائے کافی اور مشروبات مغرب سے دل بہلاتے ہیں، کھاتے پیتے اور رنگ برنگی روشنیاں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ موسیقی سے محظوظ ہوتے، رقص کرتے فواروں کو دیکھتے، زندگی حرکت میں محسوس ہوتی ہے۔ خوشی اور غم کے پل پل بدلتے رنگ، جواریوں کی مناجات، ہار اور جیت کے تاثرات کا تنوع، یہ

سب کچھ بھی قابلِ دید ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ رات گئے دیارِ مغرب میں بھی مے خانوں اور قمار خانوں کے علاوہ بیٹھنے اور گپ شپ کرنے کے لئے کم ہی مقامات دستیاب ہوتے ہیں۔ان وضاحتوں کی ایک وجہ ذاتی نوعیت کی بھی ہے۔وہ یہ کہ چند سال لاطینی امریکہ میں بحرالکاہل کے ساحل پر واقع جس گھر میں میرا قیام رہا،اس کے بالمقابل کسینو تھا۔سمندر کنارے میرے مکان اور کسینو کے درمیان صرف دورویہ سڑک حائل تھی۔اکثر یوں ہوتا کہ جب کسی دوست سے گپ شپ کا موڈ ہوتا تو اسے گھر مدعو کرنے کی بجائے کسینو کے کیفے ٹیریا میں بلوا لیتا۔وہاں بیٹھ کر کافی پیتے،شعروادب سے لے کر سیاست وتجارت سمیت دنیا بھر کے موضوعات باآوازِ بلند زیرِ بحث رہتے تھے۔کسینو میں ہمارے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ گپ شپ اور مٹر گشت کے لئے آئے ہوتے تھے۔بخدا!میں اس تمام دورانیے میں کبھی ایک بار بھی جوا نہیں کھیلا،ایک پیسے کا بھی نہیں۔سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کھیلنا بھی نہیں آتا۔کبھی سیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی،یہ کم علمی اور عدم دلچسپی بلاوجہ بھی نہیں ہے۔اس کے پیچھے بھی ایک دردناک داستان ہے۔خلاصہ جس کا یوں ہے کہ چوتھی جماعت میں تختی پر املا اور خوش خطی کے لئے استعمال ہونے والے قلم کا ہم لوگ سٹہ کھیلتے تھے،ایک دن میں نے ایم سی پرائمری سکول میاں چنوں میں اپنے ہم جماعت سے اس کے پاس دستیاب سرکنڈے کی قلموں سے زیادہ تعداد میں،اسے ادھار دے کر جیت لیں۔طے یہ پایا کہ وہ قلموں کی بجائے مجھے ایک روپیہ سکہ رائج الوقت ادا کرے گا۔کئی دن گزر گئے مگر میرے ہم جماعت نے مجھے وہ ایک روپیہ ادا نہ کیا،ممکن ہے اس کے پاس ہوگا ہی نہیں۔قصہ مختصر،میں نے شوخی میں آکر ماسٹر جی سے شکایت کردی کہ وہ میرا ایک روپیہ نہیں دے رہا۔ماسٹر جی نے استفسار کیا کہ وہ کس چیز کا؟جواب میں سادگی کے ساتھ میں نے تمام واقعہ بیان کردیا۔

ماسٹر جی نے ایک روپیہ مجھے دلوانے کی بجائے حکم دیا کہ میں مرغا بن جاؤں۔ مرغا بننا زیادہ توہین آمیز اس لئے بھی لگا کہ میں کلاس مانیٹر تھا۔ ویسے بھی کبھی کوئی ایسی کوتاہی سرزد نہ ہوئی تھی جس کی بناء پر مجھے سزا ملی ہو۔ یہ واحد واقعہ یاد پڑتا ہے، شائد آدھا گھنٹہ مرغا بنائے رکھنے کے بعد جب خلاصی ہوئی تو ماسٹر جی نے کہا، بیٹا! اب تم زندگی میں کبھی جوا نہیں کھیلو گے۔ خدا گواہ ہے کہ ماسٹر یونس کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے، بڑے نیک طینت آدمی تھے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ معین خان کو مصلوب کرنے سے پہلے ذرا یہ تسلی کرلیں کہ وہ کسینو صرف رونق میلہ دیکھنے گیا تھا یا پھر وہاں جوا کھیلتا رہا ہے۔ کیونکہ صرف کسینو چلے جانا کوئی ایسا جرم نہیں کہ اس پر چھ کالمی سرخی جمائی جائے۔ میں مانتا ہوں کہ ہمیں اپنا غم وغصہ مٹانے کے لئے قربانی کے ایک بکرے کی شدید ضرورت ہے، ایک لمحے کے لئے مگر یہ سوچئے کہ اگر واقعی معین خان سچ بول رہا ہے؟ ہوسکتا ہے وہ کسینو کھانا کھانے ہی گیا ہو؟ جہاں تک کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں پر ورلڈ کپ میں خراب کارکردگی کے حوالے سے تنقید کا تعلق ہے، تنقید کرنا ہمارا حق اور یہ بجا بھی ہے، مگر میڈیا اور عوام اسی انداز میں تنقید کریں۔ جیسے ہم اپنے بچوں کو خراب کھیلنے پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں قومی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی بھی تو اسی قوم کے بچے ہیں۔ میچ ہارنے کی صورت میں تمام ٹیم کو سزائے موت سنانے سے ہمیں گریز کرنا چاہئے۔ جیت کا اپنا مزہ ہے لیکن ہار کو تسلیم کرنے کے لیے حوصلہ اور وقار بھی معمولی بات نہیں ہے۔ آخری یہ گزارش ہے کہ کرکٹ فقط ایک کھیل ہے، اسے کھیل ہی سمجھنا چاہئے، یہ کوئی جنگ نہیں ہے۔ زندگی اور موت کا مسئلہ تو قطعاً نہیں ہے۔

## مضبوط قلعہ

ایم کیو ایم گزشتہ تین دہائیوں سے کراچی کی سیاست میں غالب قوت اور سندھ کے سیاسی منظر نامے کا ایک اہم عنصر ہے گر چہ اس نے اپنی لسانی پہچان سے آگے بڑھ کر پورے پاکستان میں اپنا اثر ونفوذ قائم کرنے کی کوشش کی تو اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی مگر کراچی اور حیدرآباد میں اسے گزشتہ تین دہائیوں میں کسی سنجیدہ چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سیاست میں مدوجزر تو آتے رہتے ہیں مگر ہر طرح کے دباؤ سے ہمیشہ یہ جماعت سرفراز ہو کر نکلی ہے، جس کی وجہ اس کی اپنے حلقہ انتخاب کے عوام میں گہری جڑیں ہیں۔ کراچی کے سابق میئر مصطفیٰ کمال جب سے خود ساختہ جلا وطنی ترک کر کے پاکستان واپس پہنچے ہیں اور ایم کیو ایم کے بانی الطاف حسین سے اپنا راستہ الگ کر کے ایک نئی سیاسی جماعت پاک سر زمین پارٹی کی بنیاد رکھی ہے تو یہ ایم کیو ایم کی سیاسی زندگی میں پہلا سنجیدہ چیلنج ہے جو اسے درپیش ہے۔ ان دنوں ایم کیو ایم (پاکستان) اور ایم کیو ایم (لندن) کا بھی میڈیا میں خوب چرچا ہے لیکن میرے نزدیک آئندہ انتخابات میں اصل مقابلہ الطاف حسین کی جماعت اور پاک سر زمین پارٹی میں ہوگا۔ گزشتہ دنوں متحدہ قومی موومنٹ کے اہم رہنماؤں نے مصطفیٰ کمال اور انیس قائم خانی کے بیانات پر اپنے ردعمل میں کہا ہے کہ وہ پانی کا بلبلہ ثابت ہوں

گے مزید فرمایا کہ نوزائیدہ پاک سرزمین پارٹی ناکام ونامراد ٹھہرے گی، کراچی ایم کیو ایم کا مضبوط قلعہ ہے۔ اس پر مجھے شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کی بوستانِ سعدی میں درج ایک حکایت یاد آ گئی۔

بیان کیا جاتا ہے، سلطان قزل ارسلان ایک ایسے مضبوط قلعے میں رہتا تھا جسے طاقتور سے طاقتور فوج بھی فتح نہ کرسکتی تھی۔اس کی بلندی کوہ الوند سے ہمسری کا دعویٰ کرتی تھی۔اس کے علاوہ مضبوطی کے یہ قلعہ خوش منظر بھی ایسا تھا کہ روئے زمین پر اس کی نظیر کہیں مشکل ہی سے ہوگی۔پیش منظر اور پس منظر کے مرغزاروں میں وہ یوں نظر آتا تھا جیسے سبز طباق میں انڈا رکھا ہو۔اتفاق سے ایک مرد درویش سیاحی کرتا ہوا اس قلعے میں بھی آنکلا، اور جب اسے سلطان کے حضور باریابی حاصل ہوئی تو سلطان نے از راہِ غرور درویش سے سوال کیا کہ حضرت نے بہت دنیا دیکھی ہے۔گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ یہ تو فرمائیے، ایسا مضبوط اور خوش نما قلعہ بھی کہیں دیکھا؟ نیز یہ کہ اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا کوئی دشمن اسے فتح کرسکتا ہے؟

سلطان کی یہ بات سن کر مردِ خود آگاہ خوب ہنسا اور پھر سلطان کی طرف دیکھ کر بولا ،قلعہ واقعی اچھا ہے لیکن میں یہ بات ہرگز نہیں مان سکتا کہ یہ مضبوط بھی ہے۔کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرے جو بزرگ تجھ سے پہلے اس میں رہتے تھے یہ موت سے ان کی حفاظت نہ کر سکا، بالکل اسی طرح یہ تیری حفاظت بھی نہ کر سکے گا۔تیرے بعد لازمی طور پر اس میں اور لوگ آباد ہوں گے۔اے سلطان! تجھے چاہیئے کہ اپنے باپ کے عہد حکومت کو یاد کرے اور اس خیال کو دل سے نکال دے کہ تو ہی سدا اس قلعے میں رہے گا۔قلعہ سیاسی ہو یا پھر اینٹ پتھر سے بنا ہوا۔حقیقت یہی ہے کہ اس کے مکین اور مالکان بدلتے رہتے ہیں۔آج تک موت سے محفوظ قلعہ نہیں بن سکا۔یہی ان قلعوں کی کمزوری ہے۔زیادہ پرانی بات نہیں کہ

یہی شہر کراچی جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان کا مضبوط قلعہ تھا۔ آنے والے کل کو یقیناً یہ کسی اور سیاسی جماعت کا سیاسی قلعہ ہوگا۔
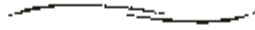
# حلال کوشر

جاپان سے لاطینی امریکہ کے سفر کے دوران ایک نئی دریافت ہوئی، انکشاف کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس فضائی روٹ پر کھانا دورانِ پرواز ہمیشہ ایک اہم مسئلہ رہتا ہے۔ مسلم کھانا عموماً دستیاب نہیں ہوتا۔ اس مرتبہ بھی جب میں نے ٹریول ایجنسی سے حلال کھانے کی بابت گزارش کی تو جواب میں انکار تھا، پھر میں نے ویجیٹیرین کھانے کا آپشن سامنے رکھتے ہوئے سبزی خوری پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ شاکاہاری ہی بن جاتے ہیں۔ مگر ماس مچھلی سے دست کش ہونے پر آمادگی کے باوجود یہ بھی آپشن دستیاب نہ تھا۔ حالانکہ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ایئر لائن میں سبزی خوروں کو دیا جانے والا کھانا بہت بدمزہ ہوتا ہے۔ میں نے ابھی تک کوشر کا نام تو سنا تھا مگر کھایا کبھی نہیں تھا۔ بڑوں نے یہ بتایا تھا کہ یہودی ایک تو خنزیر نہیں کھاتے، دوسرا ان کا گوشت بھی ذبح کیا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی آخری خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ٹریول ایجنٹ سے کہا کہ ''کوشر'' ہی دیکھ لو۔ اس نے ترنت جواب دیا، ضرور جناب! کوشر دستیاب ہے، اس متعلق رسول اکرمؐ کا فرمان بھی ذہن

میں تھا کہ رات اگر کسی غیر مسلم کے ساتھ گزارنی پڑے تو عیسائی کا انتخاب کرو، اگر کسی غیر مسلم کے ساتھ کھانا مجبوری ہو تو پھر یہودی کا انتخاب کرو۔

ٹوکیو سے میکسیکو آتے ہوئے جب یہودیوں کا کھانا کوشر سامنے آیا تو اس میں بہت ساری باتیں قابل ذکر تھیں۔ ایک تو یہ کہ عمومی کھانے کی نسبت اس کی مقدار، معیار اور پیشکش بہت اعلیٰ تھی۔ دوسرا جب میں نے اجزاء کا جائزہ لینے کے لئے بلجئم میں تیار کئے گئے، اس کھانے پر لگے اسٹیکر کا جائزہ لیا تو اس پر عربی زبان میں جلی حروف میں حلال لکھا ہوا تھا۔ مچھلی اور فروٹ و دیگر میوہ جات کے ساتھ ڈبل روٹی وغیرہ اس کھانے میں شامل تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنا مزیدار کھانا کھانے کا دورانِ سفر کم ہی اتفاق ہوا ہے۔ کھانے کے ساتھ ایئر لائن نے ایک بروشر بھی فراہم کیا تھا۔ جس میں اس کوشر کے حلال ہونے کی تصدیق مصر کی جامعۃ الازہر کے علماء کرام نے بھی کی تھی۔

چند سال پہلے میں نیویارک کے ایک ''سب وے'' ریستوران کی برانچ پر گیا۔ جس کا نہ صرف مالک یہودی تھا بلکہ یہ ریستوران مخصوص کوشر فراہم کرتا تھا۔ وہاں میں ملنے تو اپنے ایک ہم جماعت پاکستانی دوست کو گیا تھا جو کہ وہاں ملازمت کرتا تھا، مگر میں نے وہاں ایک عجیب بات دیکھی۔ اس کے گاہک عمومی طور پر حلیے کے اعتبار سے دو طرح کے لوگ لگتے تھے۔ ایک تو کھوپڑی پر ننھی سی ٹوپی ٹکائے، یا پھر سیاہ ہیٹ پہنے یہودی تھے یا پھر مسلمان کثیر تعداد میں تھے۔ عام گورے، عیسائی امریکی یہاں نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہودیوں کا اس ریستوران پر کھانے کے لئے کثیر تعداد میں جمع ہونا تو قابل فہم تھا کیونکہ یہ ریستوران مخصوص ہی کوشر کھانوں کے لئے تھا۔ مزید میرے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا مالک یہودی ہے۔ مگر مسلمان اتنی کثیر تعداد میں یہاں کھانا کیوں کھانے آ رہے تھے؟ تحقیق کرنے پر مجھے یہ جواب ملا کہ یہ کوشر کھانا حلال بھی ہے۔ اسی سوچ کے تحت

میں نے دوران پرواز کوشر کھانے کی فرمائش کر دی تھی۔ انکشاف بعد ازاں یہ ہوا کہ ہر حلال کھانا ضروری نہیں کہ کوشر بھی ہو مگر ہر کوشر کھانا ضروری طور پر حلال ہی ہوتا ہے۔
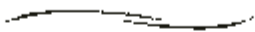
# ارژنگ کا ارتقاء

ادبی جریدہ ماہناہ ارژنگ لاہور نہ صرف میری شناخت کا حصہ بن چکا ہے بلکہ اردو شعر وادب کا ایک اہم حوالہ بھی ہے۔وفاقی اردو جامعہ اسلام آباد کی طالبہ عاصمہ بیگم ماہنا مہ ارژنگ پر ایم فل کی ڈگری کے لیے تحقیق کر رہی ہے۔اس سلسلے میں بہت سارے سوالا ت ہیں جن کے جوابات یہ ذہین طالبہ چاہتی ہے۔سوالات کا خلاصہ بیان کروں تو وہ بنیادی طور پر ارژنگ لاہور کا تعارف اور ارتقاء ہے۔یہ موضوع ایسا ہے جس سے ہمارے تقریباً تما م قارئین کی کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور ہوگی۔آج ہی مجھ سے میری مرحومہ دوست رخسانہ نور اور سید نو ر کی صا حبزادی قرا ۃالعین رینو پوچھ رہی تھی کہ ارژنگ کا مطلب کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ اردو زبان میں تصویری البم کو ارژنگ کہتے ہیں ، گو کہ یہ لفظ ہما رے ہا ں زیا دہ مستعمل نہیں ہے مگر تصویروں کے مجموعے کے لیے فارسی اور اردو زبان میں یہی واحد لفظ ہے۔

تاریخی حوالے سے بات کریں تو تیسری صدی عیسوی میں ایران سے مانی ازم

کے نام ایک مذہب کی ابتداء ہوئی، مانویت کے نام سے معروف ہونے والے اس مذہب کا بانی مانی نامی مصور اور نقاش تھا۔ اس نے تصاویر کی مدد سے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا۔ ان تصاویر کو کتابی شکل دی گئی اور اس کتاب کا نام ''ارژنگ'' رکھا گیا۔ وقت کے ساتھ مانی کا مذہب اور اسکی کتاب ''ارژنگ'' ناپید ہو گئی مگر تصاویر اور اریمیک زبان میں تحریر کردہ اس کتاب کا نام تاریخ کا ایک حوالہ بن گیا۔ یاد رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اریمیک زبان میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔ تیسری صدی سے لیکر ساتویں صدی عیسوی تک عیسائیت کے مقابلے میں ایشیاء اور یورپ میں سب سے بڑا حریف مانی کا مذہب تھا۔ ایک طرف چین اور دوسری طرف رومن سلطنت تک پھیلے ہوئے مانی کے مذہب کی ابتداء درحقیقت میسوپوٹیمیا، عراق میں ہوئی جو اس وقت ایران کے زیر نگیں تھا مگر ہمارا موضوع تو ''ارژنگ'' ہے، جس کی ایک محفوظ جلد افغانستان کے شہر غزنی سے تیرہویں صدی عیسوی میں برآمد ہوئی۔

ارژنگ کے نام سے ایران اور آذربائیجان کے علاوہ چین میں شہر بسائے گے۔ جو کہ آج بھی آباد ہیں۔ چین میں تو ''ارژنگ'' کے نام سے مانی کی آرٹ گیلری بھی قائم کی گئی ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ میں ارژنگ کے نام سے ایک اہم کردار بھی ہے مگر 1999 میں جب میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر جن میں ابرار ندیم سرفہرست تھے اور تب وہ ابرار ساحر کہلاتے تھے، ارژنگ کے نام سے ادبی پرچہ نکالنا چاہا تو فردوسی کی بجائے منیر نیازی کا نام ہمارے ذہن میں آتا تھا جو اسی نام سے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں اس نام سے پرچہ نکالتے رہے۔ منیر نیازی سے ہماری بڑی قربت تھی اور ان کی میزبانی کا شرف بھی ہمیں بارہا حاصل رہا، اس معاملے میں ان کی آشیرباد ہمیں حاصل تھی۔ سن 2000ء میں

ہمیں ''ارژنگ'' کا ڈیکلریشن مل گیا جو ہمارے لیے نئی صدی کا تحفہ بھی تھا۔

ابتداء میں ارژنگ اخبار کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انٹر نیٹ ابھی اپنی ابتدائی شکل میں تھا، سوشل میڈیا کا وجود نہیں تھا۔ ملک کے تمام اخبارات، چاہے وہ اردو تھے یا پھر انگریزی، ادب اور ادیبوں کو بس اتنی ہی جگہ دیتے تھے، جتنی آج کل دیتے ہیں۔ ایسے عالم میں بڑے بڑے ادیب دنیا سے رخصت ہو جاتے اور لوگوں کو مہینوں بعض اوقات سالوں تک خبر نہ ہوتی تھی کہ ساقی فاروقی اب اس عالم رنگ و بو میں نہیں رہے ہیں۔ ایسے عالم میں تازہ ادبی تخلیقات اور شاعری کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اہم ادبی خبروں کی اشاعت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہم دوستوں نے اس مشکل کام کا بیڑہ اٹھایا اور گزشتہ 18 سال سے ارژنگ لاہور مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

ان 18 برس میں دو اہم تبدیلیوں آئیں پہلی تبدیلی اخبار کی شکل سے ارژنگ کا کتابی صورت اختیار کرنا ہے۔ اس کا بنیادی محرک تو احمد ندیم قاسمی صاحب کا مشورہ تھا، جو ہماری ٹیم یعنی میرے، ابرار ندیم، ڈاکٹر صغرا صدف اور حسن عباسی کے لیے استاد کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا مشورہ تھا اخبار کی کوئی ''شیلف لائف'' نہیں ہوتی، اسے میگزین کی شکل دے دیں، زیادہ معتبر اور خوبصورت لگے گا۔ بلکہ انہوں نے تو ہمارے آٹھ صفحات کے اخبار کو اپنے ہاتھوں سے چونسٹھ صفحات کا میگزین بنا کر بھی دکھایا تھا۔ میں خود بھی محسوس کرتا تھا کہ ہمارے گھر کے کچن میں ''ارژنگ'' خانساما ئیں بطور تولیہ بھی کبھی کبھی استعمال کر لیتی ہیں ، اور اس ناگہانی صورت حال میں مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا شرماتی بھی نہیں ہیں۔ اس بابت دوسرا محرک انٹرنیٹ کے خیرہ کن پھیلاؤ کے ساتھ سوشل میڈیا کی آمد تھا۔ اب کوئی خبر پوشیدہ نہیں رہتی، چاہے ہمارا مین سٹریم میڈیا اسے نظر انداز ہی کیوں نہ کر دے۔ اس لیے خبری ضرورت بڑی حد تک سوشل میڈیا نے پوری کرنا شروع کر دی تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ارژنگ

اب میگزین کی شکل میں شائع ہوگا اورتخلیقی ادب کی اشاعت اس کی ترجیح ہوگی،ثقہ ادیبوں اورشاعروں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کوبھرپور موقع فراہم کیا جائے گا کہ اپنی تخلیقات قارئین کے سامنے پیش کریں۔

ارژنگ کے اس ارتقائی سفر میں دوسری بڑی تبدیلی ادارت کی تھی ۔بانی مدیر ابرارندیم چونکہ ریڈیو کے پروڈیوسر ہونے کے علاوہ اوربھی براڈکاسٹنگ کے لیے تخلیقی کام کرتے تھے،ان کی مصروفیت حد سے بڑھی تو انہوں نے ادارت ڈاکٹرصغرا صدف کے سپرد کردی، ڈاکٹرصغرا نے بڑی محنت اورمحبت سے چند سال ارژنگ کوشائع کیا مگر وہ بھی چونکہ پنجاب انسٹیٹیوٹ کی ڈائریکٹر جنرل ہیں لہذا محکمانہ مصروفیت کے باعث باہمی مشاورت سے یا

رِ دیرینہ اور

خوبصورت شاعرحسن عباسی کوارژنگ کی ادارت سنبھالنے کے لیے درخواست کی گئی۔جو گزشتہ چھ سال سے انتہائی محنت،لگن اور انہماک سے ارژنگ لاہورشائع کررہے ہیں ۔اہم بات یہ ہے کہ پرانے مدیران بھی مجلس ادارت میں نہ صرف شامل ہیں بلکہ پرچے کی اشاعت میں بھرپور حصہ ڈالتے ہیں ۔ارژنگ کی باقی پوری ٹیم میں بھی بنیادی نقطہ اشتراک باہمی دوستی ہے، دراصل ہم سب آپس میں بہت گہرے، اوراب تو پرانے بھی ہوتے جا رہے ہیں، انتہائی قریبی دوست ہیں ۔معیاری شعروادب سے محبت اور اس کی ترویج کا جذبہ ارژنگ لاہور کی ٹیم میں قدرِ مشترک ہے۔
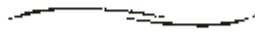
# عامر بن علی کا ادبی سفر

## محبت چھوگئی دل کو (شعری مجموعہ)

گزشتہ دس برسوں میں نوجوان شعراء کی جو نسل ابھر کر سامنے آئی ہے۔اس میں سے ایک اہم نام عامر بن علی کا ہے۔اس کی شاعری نوجوان نسل کے ساتھ ساتھ ثقہ اور معتبر ادبی حوالوں سے بھی لائق توجہ اور پسندیدہ ہے۔ (امجد اسلام امجد)

ادب سے عامر بن علی کی کمٹمنٹ ہے اور یہی کمٹمنٹ اسے کچھ کر گزرنے کے عمل پر اکساتی رہتی ہے اور بے چین رکھتی ہے۔نفرت اور منافقت سے آلودہ موجودہ ادبی فضا میں ایسے شاعروں کا وجود غنیمت ہے جو نہ صرف شاعری میں محبت اور پیار کی بات کرتے ہیں بلکہ خود اسکی عملی تصویر بھی ہیں۔ (عطاء الحق قاسمی)

## چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)

عامر بن علی کی غزلوں میں بھی ان کی ذہانت اور حساسیت جگہ جگہ نمایاں ہے مگر ان کا حقیقی تخلیقی جوہر ان کی نظموں میں اظہار پاتا ہے۔وہ جدید نسل کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کے کلام میں امکانات کے آفاق خاصے وسیع ہیں۔ (احمد ندیم قاسمی)

عامر بن علی کومل، معصوم اور سچے جذبوں کو سادگی اور سلاست کے ساتھ شعری پیکر عطا کرنے کے خوابیدہ عمل میں سرشار ہیں۔ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی لطافت اور نغمگی ہے

جو تاری یا سامع کے دل ودماغ پر پھوار کی طرح برستی ہے۔پھر دھیمے دھیمے انداز میں سلگاتی چلی جاتی ہے۔ (اسلم کولسری)

## سرگوشیاں (شعری مجموعہ)

عامر کی نظموں اورغزلوں کا دوسرا مجموعہ "سرگوشیاں" اپنے عنوان کی طرح سبک، مدھم اورنرم ونازک جذبات وخیالات سے مزین ہے۔ان نظموں سے ہمیں اپنے آپ کو تلاش کرنے والی نوجوان نسل کو تلاش کرنے اوراسے سمجھنے اور پیار کرنے کی دعوت ملتی ہے۔

(منو بھائی)

عامر بن علی زندگی کے غبارآلودراستے پر ہمہ وقت سفر کرنے والاایک نوجوان ہے۔انتھک،باعمل اوراچھے برے موسموں میں سر اٹھا کر چلنے والانوجوان۔اس نے اس سفر میں آنے والے ہرچھوٹے بڑے مشاہدے اورتجربے کواپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہےاوروہ کامیاب رہا ہے۔ (احمد عقیل روبی)

## آج کا جاپان (سفرنامہ)

آپ کے سامنے مضامین کا ایک مجموعہ ہے جوسفرنامہ نہیں، تحقیقی مقالہ بھی نہیں بلکہ "آج کا جاپان" ایک تجربہ نامہ ہے۔مصنف نے جاپانی معاشرے کواس کے اندر رہتے ہوئے خوب دیکھا، اپنا تجربہ خوب آزمایا۔پھر ایک طویل عرصہ تک اردوصحافت سے وابستہ رہنے سے تحریروں کوعمدہ لکھنے کا تجربہ بھی انہیں بہت خوب ہے۔اس لیے یہ تجربہ نامہ دوسرے سفرناموں سے منفرد ہے۔ (پروفیسر سو یامانے)

اس کتاب کی پاکستانی معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔شاید اس کے مطالعے سے چند افراد کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں بھی اپنے ملک اور قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے جاپان سے کچھ سیکھنا ہے۔اس کتاب میں سفر نامہ اور قیام نامہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کیا گیا ہے اور رواں، سلیس، ہلکی پھلکی نثر میں بہت کام کی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔ (خواجہ محمد زکریا)

## گفتگو (انٹرویوز)

عامر بن علی اور ابرار ندیم کی انٹرویوز پر مشتمل کتاب میں آپ کو گہرائی اور گیرائی نظر آئے گی۔اس کی نظیر ان کے ہم عصروں میں بہت کم کم نظر آتی ہے۔ (عطاء الحق قاسمی)

گفتگو ایک اہم ادبی دستاویز ہے جو ادب کے قارئین کے لئے حوالے کی چیز ثابت ہوگی۔ (ڈاکٹر سلیم اختر)

## محبت کے دو رنگ ـــ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (تراجم)

عامر بن علی نے ایک طرف پابلو نرودا جیسے عظیم مزاحمت کار کی منتخب شاعری کا ترجمہ پیش کر دیا ہے وہاں نرودا کے سیاسی اور ادبی مسلک کے مدمقابل عالمی شہرت یافتہ گبریلا مسترال کے تراجم بھی پیش کر دیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ شعر و ادب میں دونوں غالب مگر مدمقابل رنگوں کو محبت کے ساتھ محسوس کیا جائے، یہ پہل عامر بن علی نے کی ہے اور نام رکھا ”محبت کے دو رنگ“ (ڈاکٹر انوار احمد)

## یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)

یہ مجموعہ نئی نظموں کا نمونہ ہے۔اس کی نظم جدید نظم کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو ن۔م راشد اور میرا جی سے علیحدہ رجحان کا پتہ دے رہی ہیں۔بعض اوقات چونکا بھی دے رہی ہے۔ (شہرت بخاری)

Amir Bin Ali is one of the finest Poets from younger generation that have emerged during last decade.
**(Express Tribune Book Review)**

Staying away from his homeland makes Amir Bin Ali skeptical that he might get disconnected from his past, it is evident from his poetry and prose that he loves his country a lot and want to stay connected. He is successfully doing so through his writings.
**(Daily The Nation Book Review)**

## عامر بن علی کا ادبی سفر

- محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی
- محبت کے دو رنگ۔ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوب جاپان (کالم)
- آج کا جاپان (سفرنامہ)
- محبت کے موسم (زیرِ طبع)
- گردِ سفر (زیرِ طبع)
- مدیر اعلیٰ: ماہنامہ ارژنگ لاہور

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-37351963
nastalique786@gmail.com